اصلاحات غالب

از

علامہ علی حیدر طبا طبائی

مرتبہ

محمد عبدالرزاق راشد ایچ-سی-ایس

اصلاحاتِ غالب

مصنّفہ

علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ بہادر

پروفیسر نظام کالج

و

معلم شہزادگان اودھ و شہزادگان حضور نظام دکن

مرتبہ

مولانا محمد عبدالرزاق صاحب راشد بی اے ایل ٹی مؤلف سینیئر ڈپٹی کنٹرولر جنرل
ہائے ٹیکس و آڈٹ حکومت حیدرآباد دکن آندھرا پردیش تلخیص کلیاتِ اقبال مؤلف
انتخابِ غالب، اکبر و اقبال کی پیش گوئیاں وغیرہ

بہ اہتمام

جناب سید محمد صاحب مؤلف استاد اردو عثمانیہ یونیورسٹی

اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار

بہ سنہ ۱۹۶۳ء

پیش لفظ

از

جناب مولوی سید امجد صاحب بی ایس سی وظیفہ یاب لکچرار سائنس جاگیردار کالج حیدرآباد دکن خلف الرشید علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی (نواب حیدر یار جنگ بہادر مرحوم)

مولوی مولانا عبدالرزاق صاحب راشد وظیفہ یاب سینیر ڈپٹی کنٹرولر جنرل اکونٹس و آڈٹ ریاست حیدرآباد دکن کا شمار میرے والد مرحوم کے خاص اور ممتاز تلامذہ میں ہے۔ ایک بڑے سرکاری عہدے کے فرائض انجام دیتے ہوئے آپ نے علمی و ادبی مشغلے کیلئے وقت نکالا تیس چالیس سال پہلے اردو ادب کے بہت سے بنیادی کام انجام دیئے ڈاکٹر اقبال کی اجازت سے ان کا مجموعہ کلام کلیاتِ اقبال کے نام سے شائع کیا۔ یہ کتاب نہ صرف ہندوستان کے علمی حلقوں میں مقبول ہوئی بلکہ انگلستان میں بھی اردو داں انگریزوں نے بڑے شوق کے ساتھ اسکا مطالعہ کیا۔ ڈاکٹر نکلسن پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی نے اسکی بڑی تعریف کی اب یہ کتاب کمیاب ہے۔ ایک کتاب بھی انتخاب غالب کے نام

آپ نے سب سے پہلے سنہ ۲۵ء میں شائع کیا۔ ایک دوسرا رسالہ بھی "اکبر و اقبال کی پیشین گوئیاں" کے عنوان سے چھپوایا۔ چار جلدوں میں تاریخ صحافت اردو لکھنا چاہتے تھے مگر کچھ ایسی الجھنوں میں مبتلا رہے کہ یہ قصد پورا نہ ہو سکا۔

میں نہایت ممنون و مشکور ہوں کہ والد مرحوم کا رسالہ "اصطلاحات غالب" آپ کی توجہ سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ رسالہ شعراء کے لئے عموماً اور نوخیز شعراء کے لئے خصوصاً نہایت مفید ہوگا۔ میں نے نہایت خوشی سے اجازت دے دی ہے کہ مولانا ارشد والد مرحوم کی تمام تصنیفات و تالیفات از سر نو ایڈیٹ کر کے شائع فرما دیں۔

سید امجد

مورخہ ۱۰ / دسمبر ۱۹۶۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

فرمانروائے بھوپال پرنس حمید اللہ خاں مرحوم و مغفور علی گڈھ کالج میں میرے ہم جماعت تھے آپ کے شاہی حوصلہ مندیوں کی بدولت جب دیوان غالب (نسخہ حمیدیہ) بھوپال سے شائع ہوا تو آپ کے ارشاد کی بنا پر مفتی انوار الحق مرحوم مرتب نسخہ حمیدیہ نے دیوان کی دو جلدیں میرے پاس بھیجیں ایک جلد میں نے اپنے مطالعہ میں رکھی اور دوسری استاذی علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ کے ملاحظہ میں پیش کر کے فرمائش کی کہ مرزا غالب کا جو نیا کلام دستیاب ہوا ہے اس کی شرح لکھدی جائے تاکہ متداول دیوان کی شرح طباطبائی مکمل ہو جائے۔ دیوان کا مطالعہ کر کے ہفتہ عشرہ کے بعد علامہ غریب خانہ پر تشریف لائے اور فرمایا کہ "میری شرح کے باعث غالب پر سے مہمل گوئی کا الزام اٹھ گیا اس کو بعض اشعار کی شرح سمجھنا درست نہیں ہے کیونکہ اس میں فن شعر و سخن کے رموز و نکات آ گئے ہیں اور غالب پر بہ اعتبار فن کچھ تنقید بھی ہو گئی ہے لیکن اب پیرانی سالی کے باعث محنت و مشقت برداشت نہیں ہو سکتی اسلئے نئے کلام کی شرح لکھنے سے معذور ہوں بہتر ہوگا کہ آپ شرح لکھدیں میں اس پر ایک نظر

ڈال لونگا" یہ سُنکر مجھے بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ دیوان غالب کی جتنی شرحیں لکھی گئی ہیں ان سب میں علامہ ہی کی شرح مشہور معقول اور مستند ہے اس لئے میں نے عرض کیا کہ اگر شرح لکھنے میں معذوری ہے تو کم از کم غالب نے اپنے اشعار میں جو رد و بدل کیا ہے اور دیوان میں سے جو اشعار خارج کر دئے ہیں اس کے وجوہ قلمبند کئے جائیں میری اس استدعا کو بطیب خاطر منظور کر کے علامہ نے ترمیمات اشعار پر تبصرہ کرنے کا وعدہ کیا اور مجھ سے رخصت ہوئے۔

میں سمجھتا تھا کہ اس بہانے سے کسی طرح آہستہ آہستہ نئے کلام کی شرح بھی اعتذار کے باوجود علامہ سے لکھوا لونگا مگر افسوس کہ یہ لکھو اسکا اس خیال سے کہ مسودہ دیوان کے اندر ہی محفوظ رہے اور علیحدہ کاغذات پر لکھے جانے سے علامہ کی کبرسنی کے باعث کہیں غلط ملط نہ ہو جائے میں نے غزلوں کے ہر دو صفحوں کے درمیان ایک ایک سادہ ورق لگوا کر دیوان کو تبصرہ کے لئے بھیج دیا۔ ایک مہینے کے بعد علامہ نے مجھ کو لکھا کہ "غالب سے میں فارغ ہو چکا اسی شخص کے ہاتھ روانہ کرتا ہوں مختصر مقدمہ بھی اس پہ لکھونگا" یہ تحریر مجھے ملی مگر اس کے ساتھ دیوان نہیں بھیجا۔ دیوان لینے کو جب میں خود علامہ کے دولت کدہ کو گیا تو معلوم ہوا کہ شہر میں نہیں ہیں شیوع مرض طاعون کے سبب سے نقل مقام کر کے کسی گاؤں میں مقیم ہیں چند روز کے بعد ڈاک کے ذریعہ علامہ کا یہ عنایت نامہ ملا۔

"تسلیمات۔ میں بال سٹی کے کھیت میں اپنے ہی مکان میں ہوں دھارور چلا گیا تھا وہاں بھی یہ مرض پھیل گیا سب کو لے کر یہیں چلا آیا ہوں خداوند کریم ہم کو آپ کو سب کو محفوظ رکھے دیوان کے

نے کسی کو بھیجیے۔"

نیاز مند سید علی حیدر طبا طبائی
(۱۲ رمضان المبارک سنہ ندارد)

جب شہر مرض طاعون سے پاک و صاف ہوگیا تو میرے ہاں بتقریب سالگرہ نورچشمی اختر فاطمہ سلمہا ایک مجلس شعر منعقد ہوئی جس میں شرکت کی دعوت دی جانے پر علامہ نے یہ جواب مرحمت فرمایا۔

"تسلیم۔ صحبت شعر میں ضرور انشاء اللہ آؤنگا اصلاحات مرزا غالب پر مقدمہ لکھنے کی مہلت اس زمانے میں نہیں ہوئی مجھے۔ کچھ امتحانات کے پرچے مرتب کرنا تھے اسی میں مشغول رہا ۔ع ح۔

بعض اوقات میں نئی مطبوعات ملاحظہ کے لئے بھیجا کرتا تھا ڈاکٹر اقبال کا مجموعہ کلام اردو بھیجا تو مجھ کو یہ تجویز ارسال کی۔

"تسلیم۔ بانگ درا کا شکریہ غالب کی اصلاحیں ایک رسالہ کی صورت میں ضرور شائع ہونی چاہیئے یہ رسالہ آپ نے مجھ سے لکھوالیا ورنہ میری بے پروائی کبھی کوئی کام مجھے نہیں کرنے دیتی میں آپ کا ممنون ہوں"

راقم نیاز
سید علی حیدر طبا طبائی

مجھے اس امر کا بڑا ملال ہے کہ یہ رسالہ علامہ کی حیات میں طبع نہ ہوسکا اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اپنے دفتر کی بے پناہ مصروفیتوں کے باعث وقت نہیں نکال سکا اتنی طویل مدت کے بعد میں اس کو جناب سید محمد صاحب پروفیسر اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی توجہ و عنایت سے طبع کرا کے شائع کر رہا ہوں امید ہے کہ شرح طبا طبائی کی مانند اس رسالہ کو بھی مقبولیت حاصل ہوگی۔

میرے نزدیک علامہ نظم طباطبائی کا رتبہ اردو ادب میں بہت بلند ہے علامہ کا شمار نہ صرف حالی، شبلی، آزاد اور نذیر احمد کی صف میں ہے بلکہ ان چاروں پر علامہ کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ انگریزی داں تھے۔ انگریزی سے اسقدر واقفیت بہم پہنچائی تھی کہ انگریزی کتابوں سالوں انمبار دں اور نظموں کا شستہ اردو میں ترجمہ آسانی سے کر لیتے تھے۔

ریاست حیدرآباد دکن میں رہنے کے سبب سے بیرون ریاست علامہ کی شہرت اتنی نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے تاہم مقام شکر ہے کہ دکن میں علامہ کے کلام و کمال کی قدر کی گئی علامہ نہ صرف نظام کالج کے پروفیسر عربی، فارسی، اردو رہے بلکہ شہزادگان حضور نظام کے بھی استاد مقرر ہوئے۔ نصف صدی سے دکن میں اردو کی بے لوث خدمت کر رہے تھے اور علم و فضل کے مرکز بنے ہوئے تھے اپنی ذات سے ایک انجمن ایک ادارہ تھے جس سے مدتوں اہل دکن استفادہ کرتے رہے۔ حضور نظام نے اپنی تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد علامہ کو نواب حیدر یار جنگ بہادر کے خطاب سے مفتخر فرمایا اس سے علامہ اپنے ہم عصروں میں سر بلند و سرخرو ہوئے۔

علامہ کی گراں قدر اور سبق آموز حیات پر کسی کتاب کے نہ ہونے سے اردو ادب میں ایک خلا محسوس ہو رہا ہے علامہ کے فرزند ان سعید اس طرف توجہ مبذول کر کے تفصیلی سوانح مرتب کر دیں تو اردو لٹریچر میں بیش بہا اضافہ ہو گا۔

علامہ کی وفات حسرت آیات پر ۳۲ سال گذر چکے ہیں مگر ابتک کوئی یادگار قائم نہیں ہوئی۔ یورپ میں پیدا ہوئے ہوتے تو نہ جانے

کتنی یادگاریں بن جاتیں۔ ایسے جید عالم اور جید شاعر کو دنیائے اردو بھلا بیٹھی ہے۔ اسلئے میں اختصار کے ساتھ علامہ ایسی نادر الوجود اور عظیم الشان ہستی کے واقعات و حالات زندگی لکھتا ہوں تاکہ موجودہ اور آئندہ نسلیں علامہ کے کلام و کمال سے آگہی حاصل کریں اور فیض یاب ہوں۔

چار لڑکیاں تولد ہوئیں ۔ فرزند اکبر سید احمد صاحب وظیفہ یاب تعلقدار آجکل اہل و عیال کے ساتھ لندن میں اقامت گزیں ہیں اور فرزند اصغر سید امجد صاحب لکچرار کالج جاگیرداراں دارالحکومت حیدرآباد دکن میں مقیم ہیں

اخلاق و عادات

وضعداری منکسر المزاجی ہمدردی و ملنساری مروت و حسن خلق اور خود داری میں یکتائے زمانہ تھے ۔ حسن سلوک کے باعث اعزہ و احباب کو اپنا شیفتہ و گرویدہ بنا لیا تھا کسی سے رنجش یا عداوت نہیں رکھتے تھے دشمنوں سے بھی اسی طرح ملتے تھے جیسا دوستوں سے ۔ استغنا کا یہ عالم تھا کہ حاجتمند ہوتے ہوئے بھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کیا کسی صاحب اقتدار کے ہاں رسوخ پیدا کرنے کی پروا نہ کی ۔ اگلے زمانے کے اُن بوریانشین علما کی یادگار تھے جن سے ملنے کے لیے سلاطین کشاں کشاں آتے تھے ۔ باایں ہمہ علم و فضل تبحر نام کو نہ تھا ہر ایک کے آگے شاخ میوہ دار کی طرح خمیدہ تھے ۔ طبیعت نہایت سادہ تھی ۔ کھانے پینے لباس میں سادگی تھی ۔ آم و خربوزہ نہایت شوق سے کھاتے تھے چاء عموماً نہیں پیتے تھے خنکیات سے پرہیز کرتے تھے مشرقی عادات و اطوار خمیر میں تھے نہ کبھی سوٹ پہنا نہ سگریٹ و سگار کو منہ لگایا حقہ کے البتہ بڑے شائق تھے جس کا تمباکو مرزا اوج فرزند دبیر مہیا کرتے تھے جبکہ وہ لکھنؤ سے ماہ محرم میں مجلسیں پڑھنے اور داد سخن لینے حیدرآباد آیا کرتے تھے ۔ مرزا اوج لکھنؤ کے چکنی کے دو تین تھان بھی تحفتہً پیش کرتے تھے انیس و دبیر کے خاندان کے افراد مثلاً اوج رشید عارف نفیس سلیس مودب مرثیے پڑھنے حیدرآباد آتے تو جا کر نہ صرف علامہ سے ملتے اور خوش وقت ہوتے تھے بلکہ بحر ۔ اوج و رشید کے

دیگر اصحاب اور مہذب منجھو سوزخواں میرے گھر پر بھی آتے اور اپنی ملاقاتوں سے
مجھے مشرف فرماتے تھے غالباً میرے علامہ کے بہت قریب رہنے اور تلمیذ
ہونے کے باعث مجھ سے ملنے کی زحمت گوارا کرتے تھے۔

علامہ کی ماہوار یکصد روپیہ ضیا برج میں اس زمانے کے لحاظ سے
معقول تھی اور حیدرآباد آنے کے بعد خوشحال زندگی بسر کی۔ بگھی کی سواری
کرتے اور دارالترجمہ میں کام کرنے کے بعد وظیفہ نشین ہو گئے تھے۔ اسٹیٹ
بنک قائم ہونے کے بعد اپنی ماہوار فکسڈ ڈپازٹ رکھواتے لیکن قیام
بنک سے پہلے اپنا حساب کتاب کسی معتمد علیہ کے پاس رکھتے جن صاحب
کے پاس روپیہ رکھواتے ان سے سادہ کاغذ پر لکھوا لیتے کہ اتنا روپیہ ان کے
پاس ہے ایک کاغذ میں یہ یادداشت نظر آئی ۱۳۱۹ف میں کل رقم مولوی صاحب
(یعنی نظم طباطبائی) کی آٹھ ہزار سکہ عثمانیہ مساوی چھ ہزار آٹھ سو چھہتر کلدار
برٹش حکومت کے زمانے میں برٹش انڈیا کے سکہ کو حیدرآباد میں کلدار کہا
جاتا تھا)۔ ان میں سے مولوی صاحب نے دو ہزار دو سو روپے لے لئے اور
چار ہزار چھ سو چھہتر کلدار امانت کے رکھے ہیں۔

سید حسین

۵ر فروری کو اور ایک سو روپیہ لئے اب (۴۵۷۶) باقی ہیں۔
۲۹ ربیع الآخر (۱۳۰۷) واپس لئے اب بسلطنت ساڑھے چار ہزار کلدار
رہے۔ اس کے بعد پانسو اور میں نے لئے اب چار ہزار رہے۔

علامہ اگرچہ مشرقی وضع کے بزرگ تھے اور بادی النظر میں دو زمانہ
سے بے خبر معلوم ہوتے تھے مگر حیرت ہوتی ہے کہ جتنے مشرقی دکھائی دیتے تھے
اس سے زیادہ مغربی علوم و فنون کے والہ و شیدا تازہ ترین سائنس کی

ایجادات سے باخبر اور مغربی علم وکمال کے مورد نظر تھے۔

ملازمت کلکتہ میں ٹلیا برج میں شہزادگان اودھ کی تعلیم کے لئے برٹش گورنمنٹ نے ایک مدرسہ کھولا تھا
اور انتخاب کے واسطے ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس کے ارکان رائٹ آنریبل جسٹس امیر علی اور مسٹر گرافٹ ناظم تعلیمات تھے۔ جسٹس امیر علی کی فرمائش پر علامہ نے مستطرف کے دو باب کا ترجمہ کرکے انھیں دیا تھا اور مسٹر گرافٹ نے علامہ کی شرح شیخ بہائی تشریح الافلاک کو اپنے نام معنون کرنے کی اجازت دی تھی کمیٹی کے دونوں اراکین علامہ کے علم وفضل سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے۔ شہزادگان اودھ اپنی کسی مصلحت کی بنا پر مدرسی کے واسطے لکھنؤ کے ایک مجتہد کا انتخاب چاہتے تھے لیکن اس مخالفت کے باوجود کمیٹی کی متفقہ رائے سے علامہ کا تقرر بمشاہرہ یکصد روپیہ ماہوار معلمی پر منظور ہوگیا اور شہزادگان کی تعلیم پر مامور ہوئے۔ اس زمانے میں رواج اور ضرورت کے مطابق نہ صرف مسلمانوں میں عربی وفارسی کی تحصیل لازم تھی بلکہ ہندوؤں میں بھی ان زبانوں میں عبور حاصل کرنے لگن تھی ہندوؤں میں بھی فارسی وعربی کے عالم پیدا ہوتے تھے۔ راجہ رام موہن رائے کے عہد سے لیکر تقسیم ہند تک فارسی پر قدرت رکھنے والے سینکڑوں ہندو پیدا ہوئے ہندوؤں کی مصنفہ کتابیں نصاب فارسی میں شامل ہوتی تھیں جب ہی تو ہندوستان مشترک تہذیب وجود میں آئی اور بام عروج پر پہنچی آج بھارت میں وضع زمانہ دگرگوں ہے لیکن غنیمت ہے کہ ہندوستان کے چند ہندو ایسے جن کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اردو لکھ پڑھ سکتے ہیں یہ

باقیات الصالحات میں ہیں اردو زبان میں تحریر و تقریر کا ملکہ رکھتے ہیں مثال کے طور پر متوفی وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور موجودہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دو خط جو میرے موسومہ ہیں ان میں سے ایک یہاں نقل کرتا ہوں۔

مسز اندرا گاندھی رقمطراز ہیں

"میرے ہم وطنوں کے بھروسے اور محبت سے ہی بھارت کی خدمت کرنیکے لئے مجھے ہمت ملیگی شبھ کامناؤں کے ساتھ

اندرا گاندھی

یکم فروری ۱۹۶۶ء

شہزادگان اودھ کو عربی کتب متداول کے پڑھنے اور سمجھنے میں دقت ہوتی تھی اسلئے علامہ نے ایک سہل الحصول کتاب "تعریب الاطفال" کے نام سے تصنیف کی جس سے شہزادے آسانی کے ساتھ عربی سیکھنے لگے یہ کتاب اب نایاب ہے۔ قیام کلکتہ کے زمانے میں علامہ کی علمی و ادبی سرگرمیوں اور زندگی کی دوسری مصروفیتوں کا حال پردہ تاریکی میں ہے۔ غزلوں، رباعیوں، قطعوں، نظموں اور قصیدوں کے متعلق عموماً پتہ نہیں چلتا کہ علامہ نے کن تاریخوں میں تصنیف کیئے ہیں اس لئے ارتقائے کلام کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چند غزلیں، نظمیں اور قصیدے پرانی طرز کے مٹیا برج میں کہے گئے ہیں اور باقی تصنیفات حیدرآباد آنے کے بعد منظر عام پر آئی ہیں۔ استاذ السلطان میرزا داغ دہلوی

ے یہ خط دوران طباعت میں موصول ہوا۔

کی جو قدردانی حیدرآباد میں ہوئی اس کا علم ہونے پر علامہ کو بھی دکن کی کشش ہوئی ویسے بھی یہ وہ پُرآشوب زمانہ تھا کہ شمالی جنوبی مشرقی اور مغربی ہند کے اہل کمال کے لئے حیدرآباد پناہ گاہ بن گیا تھا سلاطین وزراء اور امرائے دکن کی حوصلہ افزائیاں انکو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں اور اقطاع ہند سے فنی علم و ہنر اصحاب کھنچ کھنچ دکن آرہے تھے چنانچہ علامہ بھی تیرہویں صدی ہجری کے آخیر میں حیدرآباد آئے اور بعض سربرآوردہ اشخاص سے ملے گر مدارالمہام وقت سالار جنگ اول بیرون شہر تھے ان سے ملاقات نہ ہو سکی اسلئے سیر و سیاحت کے بعد کلکتہ کو مراجعت کی ۱۳۰۳ھ میں نواب واجد علی شاہ کا انتقال ہو گیا تو پھر کلکتہ میں جی نہ لگا سلسلہ ملازمت بھی منقطع ہو گیا حیدرآباد چلے آئے اور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس میر افضل حسین کے فرزند کی اتالیقی پر مامور ہوئے۔ یہاں نواب عماد الملک ناظم تعلیمات سے راہ و رسم پیدا ہوئی تو انہوں نے مہتمی کتب خانہ آصفیہ کی ملازمت پر تقرر کر دیا۔ کتب خانہ شہر کے مشہور و معروف وکیل اور کل ہند کانگریس کے زبردست حامی ملا عبدالقیوم اور عماد الملک ناظم تعلیمات کی کوششوں سے قائم ہوا۔ چند مہینوں کے بعد علامہ کو نظام کالج کی پروفیسری کی خدمت دی گئی جہاں عرصہ دراز تک عربی فارسی وغیرہ کا درس دیتے رہے اور نظام کالج کے پرنسپل مسٹر میتھن کو عربی پڑھائی پانچسو روپے مشاہرہ پاتے تھے۔ نظام کالج مدراس یونیورسٹی سے ملحق تھا اور اس کا نصاب ہندوستان کے تمام دوسرے یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں سخت ہوتا تھا۔ علوم مشرقیہ کے صدر ہونے کے باعث

علامہ مدراس یونیورسٹی بورڈ آف اسٹڈیز کے رکن مقرر ہوئے بی۔اے کی جماعت میں مرزا غالب کا دیوان نصاب میں شریک کرایا طلبہ کو غزلوں کے مطالب سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی عماد الملک کی تحریک پر دیوان غالب کی شرح لکھی جس کو دیکھکر شمس العلما سید علی بلگرامی نے کہا کہ "اردو دیوان کی شرح لکھنا میری رائے میں اسکے لئے (یعنی شرح نگار کے لئے) سبکی کا باعث ہوا ہے اُسے چاہیئے تھا کہ عربی کے کسی دیوان کی شرح لکھتا" علامہ لکھتے ہیں "یہ قول مجھ تک پہنچا میں نے امرءالقیس کی شرح لکھ ڈالی۔ دونوں شرحیں لکھکر میں نے اپنی زبان کو بڑی رونق دی"۔

علامہ تیس سال تک ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں ممتحن ہوا کرتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات منشی فاضل مولوی فاضل کے ہر سال ممتحن ہوتے تھے۔ لارڈ کرزن کے عہد میں ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے بارے میں ایک کمیشن مقرر ہوا تھا جس نے حکومت ہند کو مشورہ دیا کہ ہر صوبہ کے کالجوں کا الحاق اسی صوبہ کی یونیورسٹی سے ہونا چاہیئے اس ضمن میں یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ حیدرآباد کے علوم شرقیہ کے امتحانات کا تعلق آئندہ پنجاب یونیورسٹی سے نہ رکھا جائے اور خود ریاست میں امتحانات لئے جائیں۔ حکومت حیدرآباد نے اس تبدیلی کو منظور کر لیا اور پنجاب یونیورسٹی سے تعلق منقطع ہو گیا۔ اب اس کے لئے جدید نصاب تعلیم کی ضرورت تھی جس کی ترتیب کے واسطے حکومت حیدرآباد نے ۱۹۱۳ء میں مولانا شبلی کو دعوت دی اس سے پہلے بھی ۱۹۰۶ء ۱۹۰۸ء اور ۱۹۱۰ء میں حکومت نے مولانا کو مدعو کیا تھا تاکہ

حیدر آباد میں مشرقی علوم کی یونیورسٹی قائم کی جانے کے متعلق ان کی بیش بہا رائے حاصل کی جائے اس کارروائی کی تفصیلی روداد مولانا سید سلیمان ندوی کی مصنفہ کتاب "حیات شبلی" میں مندرج ہے ۱۹۱۳ء میں مولانا شبلی حیدر آباد تشریف لائے اس زمانے میں میرے ایک ہم نام نے نامپلی کے محلہ میں مدرسہ انوار العلوم کی بنا ڈالی تھی وہ کرنل سر افسر الملک کمانڈر انچیف افواج آصفیہ کی پیشی میں کام کرتے تھے۔ کرنل صاحب موصوف نے مولانا شبلی کے لئے مصنوعی پاؤں تیار کرایا تھا جبکہ وہ بندوق کی گولی اتفاقیہ چل جانے سے حادثہ کا شکار ہو گئے تھے میں ان دنوں علی گڈھ کالج میں زیر تعلیم تھا اور موسم گرما کی تین مہینوں کی تعطیلات میں گھر آیا تھا بانیٔ مدرسہ نے مجھ سے خواہش کی کہ میں تین مہینوں تک مدرسہ کی خدمات سنبھال لوں وہ فوج کے دفتر میں میرے بڑے بھائی کے رفیق کار اور ایک بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے اسلئے مجھ سے انکار بن نہ پڑا اور میں مدرسہ کی ہیڈ ماسٹری کے فرائض انجام دینے لگا۔ بانیٔ مدرسہ نے ایک خط مورخہ یکم ماہ مئی ۱۹۱۳ء میں لکھا تھا کہ "آپ کا کرمت نامہ مورخہ ۱۸ اپریل پہنچا اور مشکور کیا۔"

"مجھے اس خبر فرحت اثر نے بالکل از خود رفتہ کر دیا ہے کہ آپ بلدہ تشریف لا کر مدرسہ انوار العلوم کی قومی خدمات میں حصہ لیں گے اور اپنی معلومات وافرہ سے قوم کے ہونہار بچوں کو بہرہ اندوز فرمائیں گے ہماری انجمن کے ارکان دلی اشتیاق سے آپ کا استقبال کرنے تیار ہیں......... ایسے طالب العلم فی الواقع کم ہونگے جنہوں نے اپنے حصول

علم کی مصروفیت کے ایام میں بھی قومی خدمات کو مقدم جانا ہو.......
میں پیشین گوئی کر سکتا ہوں کہ آپ کا وجود قوم کے لئے مغتنمات سے
ہوگا مبارک ہے وہ خاندان جس نے خوش نصیبی ایسے رکن کو پایا اور
مبارک ہے وہ قوم جس میں ایسے فدائی اشخاص پائے جائیں خداتعالی
آپ کی عمر میں برکت عطا فرمائے" بانی مدرسہ کے حسن ظن نے مجھے
مدرسہ کی خدمت پر آمادہ کر دیا موقع کو غنیمت جان کر بانی مدرسہ
کے ساتھ مولانا شبلی سے شرف نیاز حاصل کر کے میں نے مدرسہ
کے معائنہ اور طلبہ کو مخاطب کرنے کی درخواست کی مولانا نے مہربانی
سے معاً آمادگی ظاہر کی اور معائنۂ مدرسہ کی تاریخ خود ہی مقرر فرمائی
اور تاریخ مقررہ پر شام کے پانچ بجے مدرسہ میں رونق افروز ہوئے۔
لوگ تین بجے ہی سے جوق در جوق آنے لگے اور پانچ بجے تک مدرسہ
کا سب سے بڑا ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ میں نے مولانا کو مدرسہ دکھانے
کے بعد تعارف کے طور پر کہا کہ "یوں تو ملک میں بہت سے علما ہیں مگر انکے
کام درس و تدریس یا وعظ و پند و نصائح تک محدود ہیں وہ اقتضائے
زمانہ سے بالکل بے خبر اور پرانی لکیر کے فقیر ہیں ہم کو ایسے روشن خیال
علما کی ضرورت ہے جیسے مولانا شبلی ہیں جن کے علم و فضل کی دھاک
سارے ملک میں بیٹھی ہوئی ہے اور جن کے بصیرت افروز تصنیفات
کا حوالہ براؤن جیسے مستشرق نے اپنی کتاب ادبی تاریخ ایران میں دیا ہے
صرف ہند ہی میں نہیں بلکہ بیرون ہند بھی مولانا کی نظیر ملنی مشکل ہے
میں درخواست کرتا ہوں کہ مولانا کرسی صدارت کو زینت بخشیں اور
اپنے گرانقدر خیالات سے حاضرین جلسہ کو مستفید فرمائیں"۔ مولانا جب

تقریر کرنے کو اُٹھے تو دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ تالیوں کا شور کم ہونے پر جو تقریر کی اس کا خلاصہ یہ ہے۔

بانیٔ مدرسہ، صدر مدرسہ، و معززین حاضرین۔ صدر مدرسہ اور بانیٔ مدرسہ نے مجھ سے خواہش کی کہ مدرسہ انوار العلوم کا معائنہ کروں تو ایک تو مدرسہ کے نام کی کشش ہوئی دوسرے آذر تیمور ہونے کے باوجود مجھ سے عذر لنگ نہ ہو سکا اور میں معائنہ کے لئے تیار ہو گیا آج یہاں آیا۔ تو مجھے مدرسہ کی تمام جماعتیں دکھائی گئیں اور بتایا گیا کہ حکومت کی امداد کے بغیر مدرسہ چلایا جا رہا ہے طلبہ میں نظم و ضبط اور اساتذہ میں انہماک دستعدی دیکھ کر میں بہت محظوظ ہوا اور اس بات سے بھی مجھے بہت خوشی ہوئی کہ بانیٔ مدرسہ نے اپنی زندگی مدرسہ کی فلاح و بہبود و ترقی کے واسطے وقف کر دی ہے اور صدر مدرسہ ایک پرجوش نوجوان علی گڈھ کالج میں سائنس کی تعلیم پائے ہوئے ہیں قومی خدمت پر کمربستہ ہیں نوعمری میں ان کا یہ جذبۂ خدمت ملک و ملت نہایت قابل قدر ہے اس کی جتنی ستائش کی جائے کم ہے۔

مسلمانوں کے زوال کا اصلی سبب ان کی بے دینی ہے اگر وہ صحیح معنوں میں اسلامی ضابطہ پر عمل پیرا ہوتے تو آج اس پسماندگی سے دو چار نہ ہوتے، ان میں نہ تو قوت علمیہ باقی ہے نہ طاقت سپہگری انکی ترقی کی واحد تدبیر یہی ہے کہ انھیں اسلامی تعلیمات سے آراستہ کیا جائے اور جدید علوم و فنون سکھلائے جائیں اور انگریزی تعلیم لازم کر دی جائے اس خصوص میں یہ امر از بس ضروری ہے کہ ہماری تعلیم ہمارے ہی ہاتھوں میں رہے غیروں پر تکیہ نہ کیا جائے اور ہم اپنی طرز زندگی قدیم و جدید تعلیم کے مرکب

سانچے میں ڈھالیں جدید علوم و فنون سے طلبہ کو بیشمار فوائد حاصل ہونگے
اور ہماری درسگاہوں سے قابل افراد نکلیں گے جس کے سبب سے ہماری
قوم دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کا مقابلہ کر سکے گی۔ آخر میں دعا کرتا ہوں کہ خدائے
کارساز مدرسہ کو ایسا فروغ بخشے کہ یہ کالج بن جائے ایسا ہی جیسا
محمڈن اینگلو اورینٹل کالج بنا اور آج علی گڈھ کالج کے نام سے مشہور
ہے اور اس مدرسہ کے طلبہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملک و ملت
کا نام روشن کریں اور ہر جگہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جائیں۔"
یہ کہکر مولانا کرسی پر بیٹھ گئے تو پھر دیر تک تالیوں کے شور سے پورا ہال
گونج اٹھا۔ اس کے بعد بانئ مدرسہ مولوی محمد عبدالرزاق صاحب نے
مختصر تقریر میں فرمایا کہ "آج ہم اپنی خوش قسمتی پر جس قدر ناز کریں بجا ہے
کیونکہ ہمارے درمیان ایسی شمع علم موجود ہے جس کے نور سے ملک کے
تمام خطے منور ہیں۔ اور علمی حلقے مولانا کی تعریف میں رطب اللسان ہیں
جو مشورے مدرسہ کی ترقی کے بارے میں مولانا نے دیے ہیں ہمارے
حق میں گنج گرانمایہ ہیں ہم ان پران شا اللہ عمل کرینگے۔ مولانا نے آج
یہاں رونق افروز ہونے کی جو زحمت گوارا فرمائی ہے ہم اس کے لئے
تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ مولانا صد دس سال
زندہ رہیں اور اپنے انوار علم و کمال سے ہمارے ظلمتکدوں کو روشن کریں
صدر مدرسہ نے جو جدید انتظامات کئے ہیں اطمینان بخش ہیں اضافہ فیس سے
فی الواقع فنڈ میں اضافہ ہو گیا اور یہ صدر مدرسہ کی حسن کارگذاری کی چھوٹی
سی یادگار ہے صدر نے جس ایثار نفسی اور حب قومی کا پاس رکھکر اپنے
قیمتی اوقات میں مدرسہ کی خدمات انجام دیں وہ بیحد ستائش کے

قابل ہیں .... میں صدر مدرسہ کی حسن خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے منجانب انجمن پر جوش شکریہ ادا کرتا ہوں۔" میں نے بھی مولانا کی زحمت فرمائی کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ برخاست ہوگیا۔

بحمداللہ مولانا شبلی کی دعا بارگاہ رب العزت میں مقبول ہوی آج مدرسہ انوارالعلوم کالج کے درجہ تک پہنچ گیا ہے اور اس میں سینکڑوں طلبہ زیر تعلیم ہیں کیا عجب ہے کہ آئندہ چند سالوں میں یونیورسٹی کا قالب اختیار کرلے۔

مولانا شبلی کئی روز تک جدید نصاب تعلیم کو مرتب کرنے میں مشغول رہے اور ایک مفصل رپورٹ لکھی جس کو حضور نظام نے بطلب رائے علامہ نظم طباطبای کے پاس بھیجنے کا حکم صادر فرمایا۔ اس رپورٹ پر علامہ نے جو رائے دی اس کا کچھ حصہ کاغذات میں دستیاب ہوا جو درج ذیل ہے:۔

"شمس العلما مولانا شبلی کی اصلاح نصاب دارالعلوم کے متعلق سرکار نے مجھ سے بھی رائے پوچھی ہے اس رپورٹ کے ساتھ نصاب تعلیم کا نقشہ نہیں تھا اس سبب سے میں مفصل رائے نہیں دے سکتا لیکن بالاجمال عرض کرتا ہوں کہ اصلاح نصاب کی ضرورت کس وجہ سے لاحق ہوی ہے۔

۱ صرف ونحو کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں طلبہ کا وقت بہت صرف ہوجاتا ہے۔

۲ قرآن شریف کا درس میں داخل کرنا مقصود ہے کیونکہ یہ مدرسہ مسلمانوں کا ہے اور قرآن شریف پڑھنے میں معتقدات احکام دین معلوم ہونے کے علاوہ عربی بھی معتدبہ حاصل ہوجاتی ہے۔

۳ علم کلام کی بھی کوئی کتاب نصاب میں داخل کرنا منظور ہے کیونکہ کوئی

عالم دین نہیں ہو سکتا جو علم کلام کو نہ جانے اور بصیرت حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اجسام طبعی اور غیر طبعی کے حقایق سے باخبر نہ ہو۔

(۴) مولانا نے منطق و نحو کی کوئی کتاب اپنی تجویز کی ہوی فہرست میں نہیں لکھی میں شمسیہ اور شیدیہ کی تحریک کرتا ہوں کیونکہ دونوں کتابیں نصاب پنجاب میں بھی داخل ہیں اور اب بھی انکو فراموش نہ کرنا چاہیے نحو میں البتہ جو کتابیں کہ انتخاب پنجاب میں ہیں انکی عبارت معمی سے کم نہیں جس کی تحصیل میں طلبہ کو ایک عمر صرف کرنا پڑتی ہے ان کتابوں کے بجائے صرف میر و نحو میر مبتدی کے لیئے اور مفصل زمخشری منتہی کے لیئے مقرر کرنا بہتر ہوگا۔

مصر و عراق و یمن میں جو عربی بولی جاتی ہے اس میں اعراب کی زحمت بالکل نہیں ہے اور اشتقاق و تعلیلات بھی بہت کم ہیں عربی داں کو اس سے بالکل بیگانہ نہیں رہنا چاہیے اس سبب سے میری گذارش یہ ہے کہ فکاہات مفیدہ پانچ چار جز کی ایک کتاب جو مصر کی سوقی میں ہے مولوی کے درجہ میں الف لیلہ کے بدلے مقرر کی جائے اور کتاب کے ساتھ صرف میر و نحو میر طلبہ کو پڑھائی جائے اس کے بعد قرآن شریف ترکیب و تصریف کے ساتھ اور قدوری پڑھائی جائے اس کے بعد اخوان الصفا کا ایک حصہ درکس اولیہ کا تین برس میں یہ کتابیں بخوبی نکل جائینگی۔

مولانا نے علم کلام میں "معالم" امام رازی کو پسند فرمایا ہے میری رائے ناقص میں "موافق" سے بہتر کوئی کتاب علم کلام میں آج تک نہیں تالیف ہوئی بیان اس کا بہت واضح ہے اور

اس کے علاوہ متداول کتاب ہے اور اموعامہ اس کے نصاب قدیم میں بھی داخل ہیں پھر یہ خوبی ہے کہ موافق کے پڑھ لینے کے بعد ہدیہ سعیدیہ اور میبذی اور شرح ارشادات طوسی ورازی کے پڑھانے کی ضرورت نہیں رہتی ان کتابوں کے سب مباحث اس میں موجود ہیں۔ اور محض اس غرض سے کہ یورپ میں روز بروز انکشافات علمی ہوتے رہتے ہیں اور درکس اولیہ وغیرہ پچیس تیس برس ادھر کی تالیف ہے یہاں کے طلبہ کو یورپ کی کوئی بھی زبان سیکھنا چاہیے لیکن بقدر ضرورت مثلاً انگریزی پڑھیں تو چوتھی کتاب تک پڑھنا کافی ہے چار کتابوں میں اتنی انگریزی آسکتی ہے کہ علوم کی کتابیں کو کسی کی مدد سے پڑھ سکیں اس سے زیادہ انگریزی سیکھنے میں اوقات صرف کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے ہم لوگوں کو اس کا تجربہ عربی میں ہو چکا ہے کہ بغیر اس کے کہ کوئی کتاب ادب کی پڑھیں عربی میں علمی کتابیں پڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور بخوبی چلتے ہیں علمی کتابوں میں کام لیکن کے سوا زباندانی کا بھی زیادہ نہیں پڑتا۔

مولانا شبلی کی رپورٹ نصاب دارالعلوم میں علامہ نے جو ترمیمات تجویز کی تھیں ان کا علم مولانا سید سلیمان ندوی کو شاید نہ تھا ورنہ وہ حیات شبلی میں ان کا ذکر ضرور کرتے۔ مجوزہ ترمیمات کے بموجب نصاب کو حکومت نے منظور کر لیا اور اسی نصاب کے موافق تعلیم ہونے لگی اور ریاست میں امتحانات کا آغاز ہوا۔

کئی برس تک علامہ مدراس یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز کے ممبر اور ممتحن تھے یونیورسٹی میں تحریک کی کہ دبیر اور فضل العلما کے موقر

خطابات فارغ التحصیل اور کامیاب طلبہ کو یونیورسٹی سے ملا کریں یہ تحریک منظور ہو گئی مگر دو برس تک صوبہ مدراس کا ایک طالب علم بھی ان امتحانات میں شریک نہ ہوا جس پر یونیورسٹی نے ادھر علامہ کو توجہ دلائی کہ امتحانوں کی کساد بازاری کا یہ سبب ہے کہ یونیورسٹی نے ایسے طلبہ کے واسطے میٹرکٹ کی کامیابی لازم قرار دی ہے اس لئے عام طور پر امیدوار شرکت امتحان کی جسارت نہیں کرتے۔ یونیورسٹی کی مجلس نصاب کے صدر سر عبدالرحیم تھے ان سے مل کر علامہ نے اس ضرورت کو سمجھایا کہ علوم مشرقیہ کے امتحانات میں شرکت کے لئے میٹرک کی قید اٹھا دینی چاہئے۔ مولوی بدل امتحاں اور شمس العلما نواب عبدالرحمن خاں شاطر نے علامہ کی پرزور تائید کی نتیجۃً میٹرک کی شرط برخاست کر دی گئی۔

علامہ امتحانات کے جو پرچے مرتب کرتے تھے ان سے طلبا کی تیاری امتحان کی جانچ اچھی طرح ہوتی تھی۔ ایک پرچہ یہاں نقل کیا جاتا ہے جو بی۔ اے کے طلبہ کے واسطے اردو تاریخ زبان و ادب کے سبجکٹ سے متعلق اپریل ۱۹۲۸ء میں دیا گیا تھا۔ اس کے بعض لفظ نہیں پڑھے جا سکے۔

---

(۱) امیر خسرو نے گداگر کی ایک صدا کو...... ایک قطعہ میں نظم کیا ہے۔

کچھ گھڑے سنوارے پکارا   آخر نہ گھڑا نہ سنوارا

اپنی رائے لکھو کہ ان مصرعوں کی اردو کس طرح کی ہے اور محاورۂ حال کی اردو میں اور اس میں کیا فرق ہے۔

(۲) غالب کے اشعار ذیل میں کونسے ایسے محاورے ہیں جو اب متروک ہو گئے ہیں۔

مستانہ طے کروں ہوں رہ وادی خیال تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے
سایہ مرا مجھ سے مثل دور بھاگے ہے اسد پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

(۳) اُلٹی رہیں اس طرح (نے) کا استعمال ذیل کے دو شعروں میں ہے کہاں سے آیا۔

طرے اعزاز کے جن لوگوں نے ہیں پلٹے ہوئے
بالیں گیہوں کی وہ شملہ میں ہیں لٹکائے ہوئے (آزاد)

ہم نے سب اس کی طرز ناز پہچانی ہوئی
چال پہچانی ہوئی آواز پہچانی ہوئی (ظفر)

(۴) سودا اور ذوق کے قصائد سے غالب کے قصیدوں کا مقابلہ کرو اور یہ بیان کرو کہ اُن کے اور انکے طرز بیان میں کیا فرق ہے۔

(۵) عربی کے جو الفاظ فارسی والوں کے استعمال میں نہیں ہیں اردو میں بھی ایسے الفاظ کسی نے داخل نہیں کئے اس کی وجہ لکھو۔

(۶) وہ کونسی زبانیں ہیں جن کی آمیزش سے اردو کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ انگریزی کے چند الفاظ ایسے لکھو جو اردو ہو گئے ہیں اور کچھ لفظ ایسے بھی لکھو جنھیں انگریزی داں اہل قلم اردو میں لکھ جایا کرتے ہیں مگر وہ الفاظ بیگانہ معلوم ہوتے ہیں۔

(۷) بقانے یہ مطلع کہا۔

ان آنکھوں کا نت گریہ دستور ہے دو آبہ جہاں میں یہ مشہور ہے

میر نے خدا جانے سُنکر کہا یا توارد ہوا

مے دن گئے کہ آنکھیں دریا تھیں سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دو آبہ

بقا و میر کے ان دونوں شعروں میں محاکمہ کرو کہ کس نے اچھی طرح کہا ہے

محمد امان نثار کے اس شعر میں

ہم آگے ہی سمجھے تھے وہ گھر کو سابھاینگے
جس وقت گجر باجا ماتھا مرا ٹھنکا تھا

اور میر کے اس شعر میں محاکمہ کرو

بھولیں نئیں تم جس دم سج دھج نکلے تھے اک پھیرا
اس دن ہی تھیں دیکھے ماتھا مرا ٹھنکا تھا

اور یہ بتاؤ کہ دونوں میں سے کس نے محاورہ کو اچھی طرح صرف کیا۔

(۸) شعرا کے ۵ طبقے جن کا ذکر آب حیات میں ہے کتنے زمانے میں گزرے اور ناسخ کا یہ مقطع ہے

ناسخ ہے میر سلمہ اللہ کی زمین اک .... کو باندھا ہزار رنگ

ان کے دوسرے دیوان میں ہے اور آخر عمر کا کلام ہے سلمہ اللہ لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ قریب میر کے معاصر ہیں پھر کیا وجہ کہ آزاد نے میر کو دور سوم اور ناسخ کو دور پنجم کے شعرا میں گنا ہے۔

۱۳۳۵ھ ۱۹۱۷ء میں علامہ کا تقرر شہزادگان حضور نظام کی تعلیم کے لئے ہوا نواب اعظم جاہ ولی عہد اور نواب معظم جاہ کو (۴) برس تک پڑھاتے رہے۔ انہی نے معظم جاہ متخلص بہ شجیع کو شاعری کا چسکہ لگایا۔ کلام شجیع قابل دید ہے۔

۱۹۱۸ء میں دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اصلاح زبان وطرز بیان کی خدمت متعلق ہوئی جہاں تین برس تک کارگذار رہے اس کے بعد وظیفہ پر سبکدوشی حاصل کی مگر علامہ کی خدمات اتنی گرانقدر تھیں کہ ناظم دارالترجمہ منشی عنایت اللہ صاحب فرزند منشی ذکاء اللہ کو یہ تحریک کرنا پڑی کہ

"نواب حیدر یار جنگ کی جگہ پُر کرنے کے لئے جو عنقریب خالی ہونیوالی ہے میں حال میں ایک انتظام پیش کر چکا ہوں لیکن جس وقت سے یہ انتظام پیش کیا ہے اس غور میں ہوں کہ ترجموں کی ادبی اصلاح کا کام جس خیر و خوبی و حسن قبول کے ساتھ نواب صاحب ممدوح انجام فرماتے رہے ہیں دوسرا ان کی شل نہ ملیگا ترجموں کے ایسے اصلاح دینے والے کہ اصل مطالب پر نظر رکھ کر جس فقرے میں کوئی لفظ درست کر دیں زبان کے اعتبار سے اس میں جان پڑ جائے حقیقت میں نادر الوجود ہیں۔ نواب صاحب کی اکثر اصلاحیں میری نظر سے گذریں مجھ کو تو وہ ہمیشہ سبق لینے کے قابل معلوم ہوئیں حقیقت میں آپ ان کاملین فن میں ہیں جن کا تلاش کرنا مشکل اور تلاش میں کامیاب ہونا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ ادب و انشا میں اس وقت آپ کا دم مغتنمات سے ہے ایسی قابل قدر زندگی سے جتنے دن نفع مل سکے حاصل کرنا مناسب ہے اگر توسیع خدمت چند سال کے لئے اور ممکن ہو سکے تو میں مترجمین کے حق میں ایک نعمت سمجھونگا۔"

حکومت نے یہ تحریک منظور کر لی اور علامہ کا دوبارہ بلا تعین مدت دار الترجمہ میں تقرر ہو گیا جہاں چھ سال تک مفوضہ فرائض انجام دیتے رہے۔

ملک میں بہت سے ارباب علم و ادب علامہ کے علم و فضل و تبحر کے معترف و مداح تھے مشتے نمونہ از خروارے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی جو خود ایک عالم و ادیب تھے لکھتے ہیں۔

"جناب مولوی سید علی حیدر صاحب طبا طبائی لکھنوی متخلص بہ نظم المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ بہادر علم و ادب میں اگلے اساتذہ کی یادگار

ہیں آپ کی نظم صحت زبان و الفاظ و متانت مضامین کے لحاظ سے ایک خاص طرز رکھتی ہے بعض معرکتہ الآرا انگریزی نظموں کا ترجمہ اس قوت فکر سے فرمایا کہ اصل کا رنگ پیدا کردیا مثلاً گرے کی مشہور نظم گورستان کا۔ علاوہ نظم آپ کے علمی و ادبی تبحر کی یادگار آپ کے وہ رسائل و مضامین ہیں جو علمی مسائل پر لکھے ہیں اور جن کا دائرہ ادب سے لیکر سائنس تک محیط ہے قدیم شائستگی و تہذیب کا نمونہ بھی طباطبائی صاحب کی ذات میں آجکل کے اہل نظر دیکھ سکتے ہیں۔ مٹیا برج کی وہ شاہی و قدیم صحبت جو گویا سرزمین ہند میں مغل تہذیب کی خاتمہ" باب تھی برسوں نواب صاحب نے اس سے استفادہ کیا جامعہ عثمانیہ میں دار الترجمہ کے تقرر کے زمانے میں جو خدمات آپ نے تصحیح ترجمہ کی کیں وہ بھی بلند پایہ تھیں"۔

علامہ نے ترجمہ میں اصلاح زبان کا کام انجام دیتے ہوئے تاریخ لیبی کا ترجمہ بھی کر ڈالا جب میں نے پوچھا کہ ترجمے کا معاوضہ کتنا ملا تو فرمایا کہ ترجمہ پیش کرکے مدت ہوئی کوئی معاوضہ اب تک نہیں ملا نہ میں نے طلب کیا میں نے مشورہ دیا کہ حق طلب کرنے کے بغیر کچھ نہیں ملتا اس لئے آپ مولانا شیروانی کے نام ایک یادداشت بھیج دیں کچھ تامل کے بعد کہا کہ اچھا بھیجدونگا گر میں سمجھا کہ میرے چلے آنے کے بعد پھر بھول جائیں گے اسلئے علامہ کو اکسایا کہ میرے سامنے لکھ دیں اس پر قلم دوات منگائی اور یہ مکتوب لکھکر بھیجدیا"۔

"مجلس جامعہ کے ارکین میں جناب سے بہتر کوئی ان باتوں کو نہیں جانتا۔

(۱) اڈمنسٹرلیو بورڈ سے جناب کی صدارت میں تصحیح تراجم یعنی

ناظر ادبی کی خدمت مجھے ملی۔

(۲) اس خدمت کا سر انجام دینا میرے ذمہ رہا کوئی مددگار بھی مجھے نہیں ملا۔

(۳) میرے لئے ممکن نہ تھا کہ اصلاح تراجم کے سوا خود بھی کسی کتاب کا ترجمہ کرتا۔

(۴) پھر اس بات کو بھی آپ ہی خوب جانتے ہیں کہ طبری کا ترجمہ کرنا امر عظیم ہے اور ہر شخص کا کام نہیں باوجود اس کے میں نے ایک جلد کا ترجمہ کر کے امتثال امر کر دیا ناظم صاحب دارالترجمہ نے اس خدمت کے صلہ کی میرے لئے سفارش بھی کی ہے یہ کتاب سرکاری دارالطبع میں مدت ہوئی چھپ بھی گئی لیکن اس کا فیصلہ نہیں ہوا کہ مجھے صلہ کا حق ہے یا نہیں۔

اس باب میں جناب سے بھی سفارش کا امیدوار رہوں گی۔

مولانا شیروانی صاحب نے اس مکتوب پر یہ تجویز کی۔

"ایڈمنسٹریل بورڈ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد نواب حیدر یار جنگ بہادر دارالترجمہ میں ادبی ناظر مقرر ہوئے تراجم کی زبان کی تصحیح و تہذیب مفوضہ خدمت تھی یہ بھی میرے علم میں ہے کہ کوئی مددگار انکو نہیں دیا گیا تھا اور کام پورے وقت کا تھا تاریخ طبری علاوہ تاریخ کی معرکتہ الآرا تصنیف کے بلحاظ ادب عربی بھی مشکل اور بلیغ کتاب ہے اس کے ترجمہ پر جو مترجم دارالترجمہ سے نامزد ہوئے وہ کامیاب نہ ہو سکے انتہا یہ کہ تاریخ ابن اثیر بھی جو طبری سے بہت زیادہ آسان ہے بہت دقت سے ترجمہ ہو سکی طبری کا ترجمہ بجائے خود مہتم بالشان اور پوری محنت اور انہماک سے

سرانجام ہو سکتا تھا۔

میرے خیال میں اس کا صلہ طباطبائی صاحب کو ملنا ایک علمی خدمت و قدردانی ہوگی بلکہ مترجم صاحب کی محنت کا صلہ واجب۔

۱۶ ربیع الاول ۱۳۴۷ھ
۱۹۲۸ء

صدر یار جنگ

پریسیڈنٹ ایڈمنسٹرل بورڈ (عثمانیہ یونیورسٹی)

بالآخر طبری کے ترجمے کا رقمی معاوضہ علامہ کو مل گیا۔

علامہ نے پچھلے سال تک تراجم میں جو اصلاحیں دی ہیں قابل دید اور بقول منشی عنایت اللہ صاحب ناظم سبق لینے کے قابل ہیں۔ ان اصلاحوں کو جمع کر کے شائع کر دیا جائے تو اردو ادب کی تاریخ کو ایک نیا باب ہاتھ آئیگا۔ مضمون نگاروں کو چاہئے کہ اپنے مضامین ہمیشہ اشاعت سے پہلے کسی مسلم الثبوت ادیب کو دکھالیا کریں کیونکہ نثر بھی نظم کی سی خامیوں سے پُر اور محتاج اصلاح ہوتی ہے۔ غزلوں پر استادوں کی اصلاحیں تو ہوتی رہتی ہیں لیکن نثر کی اصلاح کا رواج بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے کیا اچھا ہو اگر اصلاح نثر کے ادارے کھل جائیں اور ملک میں مشاعروں کی مانند مناثروں کی محفلیں برپا ہوا کریں۔

تلامذہ علامہ اپنے شاگردوں کے معاملے میں بڑے خوش نصیب تھے ایسے نامور تلامذہ پیدا کئے جنہوں نے ہندوستان کے علمی و ادبی حلقوں میں اپنی تخلیقات عالیہ سے ایک تہلکہ مچا دیا اور کئی سال تک ادبی دنیا پر چھائے رہے ان شاگردوں میں مولانا عبدالحلیم شرر

لکھنوی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر المتخلص بہ شاد صدر اعظم سلطنت آصفیہ سرآمد روزگار تھے، مرزا آسمانجاہ انجم خلف نواب واجد علی شاہ تاجدار اودھ بھی ممتاز اور بلند درجہ رکھتے تھے ان چاروں کا ذکر آگے آئیگا دوسرے شاگردوں کے نام یہ ہیں

اصغر یار جنگ اصغر، شہید یار جنگ شہید، میر میر شائق حسین سفیر، حکیم محمد عابد عابد، نواب سفس علی لمعہ، غلام مصطفے ذہین، عابد مرزا بیگم المتخلص بہ بیگم، عابد علی قسمت مرزا محمد بہادر یاور، قاضی زین العابدین عابد ہمپداں راشد۔ ان کے علاوہ اور بہتوں کے اسماء میرے حافظے سے محو ہو گئے ہیں۔

(۱)

مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی

مولانا شرر کی تصنیفات و تالیفات سے ملک کے تمام علمی و ادبی طبقے خوب واقف ہیں آپ کثیر التصانیف ہونے کے علاوہ ماہوار رسالہ دلگداز اور ہفتہ وار اخبار مہذب نکالتے تھے۔ دلگداز کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور برسوں جاری رہا اور ادبی دنیا پر اپنے اثرات چھوڑ گیا۔

مولانا شرر ہی نے سب سے پہلے اہل ملک کے سامنے پاکستان کا تخیل پیش کیا ۱۸۹۰ء میں اخبار مہذب میں ملک کی سیاست پر کبھی کبھی شذرے[1] لکھا کرتے تھے ۱۸۹۰ء کے شذرے میں بتایا گیا ہے کہ امام باڑہ

---

[1] میں ملک کے مشہور ادیب جناب ناظم سیتاپوری کا ممنون ہوں کہ آپ نے اخبار کا تراشہ جس میں یہ شذرے مندرج تھے مجھ کو ارسال کرنے کی زحمت گوارا فرمائی۔

ہگلی کے پاس ایک بنگالی بابو محض مسلمانوں کو چھیڑنے اور اشتعال دلانے کی غرض سے سنکھ اور گھنٹے بجا کر ان کی عبادت کی توہین کرتے ہیں اس قسم کے اشتعال سے فساد ہو جایا کرتے ہیں۔ ۱۵ اگست کے شمارے میں آریہ سماج سبھا کی خدمت میں گذارش کی ہے کہ وہ مسلمانوں سے لڑائی جھگڑا نہ مول لیں۔ ۲۲ اگست کے پرچے میں عید الضحیٰ کے موقع پر فسادات کا ذکر کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جو لوگ یہاں کی قوموں کو ایک بتاتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں بعض مقامات پر ہندوؤں نے مسلمانوں کا معاشی مقاطعہ کیا تھا اس کے مشاہدہ پر یہ تجویز بھی تصور نہایت سنجیدہ اور شریفانہ الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

"ہمارے خیال میں اگر ایسا ہی وقت آگیا ہے کہ کسی کی مذہبی رسوم بغیر کسی کی توہین اور دل شکنی کئے بغیر پوری نہیں ہوتیں اور نہ آشنا صبر و تحمل ہے کہ دوسرا فریق ان باتوں کو طرح دے تو ہندوستان کے اضلاع کو ہندو و مسلمان آپس میں تقسیم کر لیں اور اپنی آبادی علیحدہ کر لیں۔"

سطور بالا سے ایڈیٹر اخبار مہذب کی سیاسی بصیرت اور دور بینی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا شرر کے اسی خیال کو اقبال نے ۱۹۳۰ء میں وضاحت کے ساتھ اپنے خطبہ صدارت مسلم لیگ میں ظاہر کیا اور نصف صدی کے بعد مولانا شرر کی تجویز ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند پر منتج ہوئی اور پاکستان عالم وجود میں آگیا۔

مولانا شرر کی ادبی کاوشوں کا مرقع رسالہ دلگداز ہے جس کو آپ ہمیشہ اپنے ہی قلم سے پُر کرتے تھے اور شاذ و نادر اس میں کسی دوسرے کا مضمون شائع ہوتا تھا دلگداز کی یہ منفرد حیثیت تھی کہ صرف ایڈیٹر ہی کے مضامین سے بھر جاتا تھا۔ لیکن مولانا اپنے استاد کو طلب مضمون میں خطوط لکھتے تھے ایک خط ملاحظہ ہو۔

دلگداز گزہ بزن بیگ خاں
لکھنو

۳ر شوال ۱۳۴۰ھ
۱۹۲۲ء
یوم چہار شنبہ

استاذی وطاذی مدظلہ العالی

آداب و نیاز کے بعد التماس ہے کہ دونوں رسالے پہنچے۔ میں نہایت شکر گزار ہوں۔ دلگداز کے نکلنے میں بد نظمی ہے جب پرچے نکلیں گے تو ان میں سے یہ لکھونگا۔ اگر جناب اتنی زحمت گوارا فرمائیں کہ مٹیا برج کے خصوصاً بادشاہ کے اور وہاں کے شعرا کے مختصر حالات قلمبند فرمادیں تو بڑی مرحمت ہوگی۔

خاکسار

محمد عبد الحلیم شرر

علامہ طباطبائی انگریزی نظموں کے ترجمے اس خوبی سے کرتے تھے کہ وہ اصلی معلوم ہوتے تھے دلگداز کے شمارے بابتہ صفر ۱۳۱۶ھ ۱۸۹۸ء میں ہلی دفصاحٹیز کی توصیفی تمہید کے ساتھ علامہ کا شہرہ آفاق ترجمہ گرے کی ایلجی کا بہ عنوان گورِ غریباں چھپا تھا گرے انگلستان کا بہت مشہور شاعر ہے اس کا دیوان مرزا غالب کے دیوان کے مانند مختصر مگر پرمغز ہے اس کی ایلجی (مرثیہ) انگلستان کے بچے بچے کی زبان پر ہے

ہندوستان میں کون ایسا صاحبِ ذوق ہے جس نے یہ مشہور ترجمہ نہ پڑھا ہو۔ ترجمے میں انگریزی کا عروض برقرار ہے اور اس کے چند بند گرے کی قبر پر آویزاں ہیں۔ اس کا پہلا بند یہ ہے :

وداعِ روزِ روشن ہے گجرِ شامِ غریباں کا
چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے
قدم گھر کی طرف کس شوق سے اٹھتا ہے دہقاں کا
یہ ویرانہ ہے میں ہوں اور طائر آشیانوں کے

(۲)

پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی

سرشار علامہ کے دوسرے مشہور و معروف شاگرد ہیں ۱۸۴۶ء میں لکھنو میں پیدا ہوئے عربی، فارسی، انگریزی سے واقف تھے آپ کا اشہبِ قلم میدانِ ادب میں سرپٹ دوڑتا ہے آپ کی شہرت "فسانۂ آزاد" پر قائم ہے اس کتاب سے علمی دنیا میں ایک ہلچل پڑ گئی ابتدا میں اس کتاب کے ابواب اودھ اخبار میں جس کے ایڈیٹر سرشار تھے قسط وار چھپتے رہے کسی روز کوئی قسط ناغہ ہوتی تو قارئین اخبار بے چین ہو جاتے ان مضامین کی مانگ اس قدر بڑھی کہ انکو کتابی شکل میں طبع کرنا ضروری ہو گیا فسانۂ آزاد ۱۸۸۰ء اور بقول بعض ۱۸۸۱ء میں چار جلدوں میں چھپا (۳۹۰۴) صفحات پر مشتمل ہے اس میں لکھنو کے تمدن و معاشرت کی ایسی جاندار تصویریں کھینچی ہیں کہ متحرک نظر آتی ہیں جو شخص فسانۂ آزاد کا مطالعہ کریگا اس کو لکھنو کی زندگی چلتی پھرتی نظر آئیگی۔ جامِ سرشار، سیرِ کہسار، کامنی، خدائی فوجدار ان کی دوسری مشہور

تصانیف ہیں۔

سرشار کے لئے لکھنؤ میں روزگار کچھ ایسا قابلِ اطمینان نہ تھا مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت مدار المہام سلطنت دکن کی قدر دانیوں کی خبر سنی تو تلاش معاش میں لکھنؤ سے نکل کھڑے ہوئے اور ۱۹۰۳ء میں حیدرآباد پہنچکر مہاراجہ بہادر کے متوسلین میں شامل ہو گئے۔ رسالہ دبدبۂ آصفی ۱۹۰۴ء میں جاری ہوا تھا اس کے مہتمم مقرر ہوئے مہاراجہ بہادر نے دو سو روپے مشاہرہ مقرر کر دیا۔ سرشار کی تصنیفات و تالیفات کا عکس مہاراجہ بہادر کی کتابوں میں نظر آتا ہے۔ سرشار اکثر علامہ کے پاس حاضر ہوتے رہتے اور کہا کرتے کہ اب لکھنؤ میں کیا رکھا ہے علامہ کی ذات میں سارا لکھنؤ جمع اور آنکھوں کے سامنے ہے۔

علامہ کے چار شاگردوں شرر، سرشار، شاد، انجم کے مخلصوں کی تاثیر دیکھئے:

(۱) شرر نے بدر النسا کی مصیبت نامی کتاب شائع کر کے ایک چنگاری چھوڑی پردہ یا بے پردگی پر ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہوا اور پردہ کے مباحث ایک مدت تک اخباروں میں چھپتے رہے مولانا نے پھر یہ قیامت برپا کی کہ حضرت سکینہ کی لائف لکھنے لگے مضامین سلسلہ وار نکلتے رہے جو فرقہ امامیہ کے معتقدات کے مخالف تھے اس پر وہ شور مچا کہ اشاعت بند کر دینی پڑی۔ کچھ مدت کے بعد کتاب کی تکمیل کی۔

(۲) انجم افق شاعری پر ایسے چمکے کہ لوگ انکو لکھنؤ کا داغ کہنے لگے

لیکن سلطنت ہاتھ سے جانے کا داغ دل پر تھا عمر طبعی کو پہنچنے سے
پہلے ستارۂ سحر کے مانند بجھ گئے۔

۳ شاد - ملنے والوں کو باغ و بہار بنا دیتے تھے دربار میں جو آتا مسرور و
شاد ماں جاتا اور مدتوں حاضری دربار کی یاد دل میں تازہ رکھتا۔

۴ سرشار تخلص کی مناسبت سے رات دن مخمور رہتے تھے شراب
آپ کے منہ سے چھوٹتی نہ تھی یہاں تک کہ جان لیکر رہی۔

افسوس ہے کہ قیام حیدرآباد کے زمانے میں سرشار کی علمی
مصروفیتوں اور اہل قلم کے ساتھ ملاقاتوں اور صحبتوں کا حال کسی نے
نہیں لکھا اس کے متعلق ریسرچ کا موقع ہے کیونکہ حیدرآباد سے متعلق
حالات و واقعات تفصیل سے معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔

نواب فصاحت جنگ جلیل مرحوم کے فرزند اکبر جناب اثر نے
ایک واقعہ مجھ سے بیان کیا کہ سرشار صبح کو چاشت سے فارغ
ہو کر اکثر جلیل مرحوم سے ملنے آیا کرتے اور کچھ باتیں کرنے کے بعد
مہاراجہ بہادر کی ڈیوڑھی پر جایا کرتے تھے۔ ایک دن جلیل مرحوم سے
خلاف توقع بہت دیر تک مصروف گفتگو رہے اور دوپہر کے وقت
دریافت کیا کہ کھانا تیار ہے یا تیار ہو رہا ہے ملازم سے پوچھا اور ملازم
نے ہنسی میں پوچھکر اطلاع دی کہ کھانا بالکل تیار ہے چنانچہ دسترخوان
بچھا دیا گیا اور کھانا چن دیا گیا سرشار نے سبھوں کے ساتھ جو
موجود تھے تناول طعام کیا اور اس کے بعد حسب معمول مہاراجہ بہادر
کے دربار میں پہنچکر سلام کرنا ہی چاہتے تھے کہ لڑکھڑا کر گر پڑے اور
تڑپنے لوٹنے لگے مہاراجہ بہادر نے فوراً ڈاکٹر کو طلب کیا مگر اس سے قبل

کو ڈاکٹر آکر دیکھتا سرشار سرگباش ہوگئے سارے شہر میں آناً فاناً موت کی خبر پھیل گئی۔ ۲۰۰۱ء میں انکی موت کا حادثہ دنیائے اردو کیلئے زبردست صدمہ اور ناقابل تلافی نقصان کا موجب ہوا۔

(۳)

مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت متخلص بہ شاد

امیر ابن امیر یمین السلطنت کی نادر الوجود ہستی ہندوستان کی مشترک تہذیب کی تنہا یادگار تھی۔ مہاراجہ بہادر راجہ ٹوڈر مل راجہ چندو لال راجہ نریندر بہادر کے چشم و چراغ تھے اہل سیف بھی تھے اور اہل قلم بھی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں نواب میر محبوب علی خاں شاہ دکن نے سلطنت کی مدار المہامی کے واسطے امرائے ملک میں سے مہاراجہ بہادر کا انتخاب کیا جس کو لوگوں نے بہت پسند کیا مہاراجہ بہادر جامع الکمالات تھے اور امرائے ملک میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے مہاراجہ بہادر کے اوصاف حمیدہ اور حالات زندگی بیان کرنے کے لئے کئی ضخیم مجلدات درکار ہونگے مہاراجہ بہادر کی قیمتی اور سبق آموز زندگی حیات انسانی کی معراج تھی۔ آئین حکمرانی میں موجودہ حکمراں مہاراجہ بہادر کی تقلید کریں تو ہندوستان میں ہر طرف شانتی نظر آئیگی اور نظم و نسق اعلیٰ معیار حاصل کرلیگا۔ مہاراجہ بہادر کے منتخب ہونے پر [illegible] نے تہنیت کہی جس کے چند شعر یہ ہیں۔

ہوا سنکی تو مستانہ گھٹا اٹھی تو متوالی
چمن نے خود فروشی اوڑھ صبا نے کی نرالی

جواہر ریز ہے بستاں کہ گوہر ریز ہے باراں
نہیں ہیں ہار نالے موتیوں کے پہنے ہیں مالی

چمن نے شاد کے دستِ کرم کی وضع سیکھی ہے
یہ عالم ہے بڑھایا ہاتھ اور خود جھک پڑی ڈالی

ہوا ہے روح پرور وقت جاں افزا عجب کیا ہے
کہ چہکے بلبلِ تصویر یا مہکے گلِ قالی

ہوا ہے جلوہ افزا کرسیٔ وزارت پر
مہیمِ عرش ہے عالم میں جس کا رتبہ عالی

مقابل ہیں فلک کے اب زمیں یوں ناز کرتی ہے
کہ تجھ کو خلعتِ پُرزر ملا مجھ کو قبا شالی

درِ دولت پہ ہے مجرائیوں کا ہجوم ایسا
گئی مشرق سے مغرب سر بسر خورشید کی تھالی

لکھا ہے آبِ زر سے برقِ مہرِ درخشاں پر
مہاراجہ کشن پرشاد دام ظلہ العالی

یہ وہ عالی نسب ہے ہند میں اسلاف نے جس کے
مظالم کی بنا ڈھائی مکارم کی بنا ڈالی

تھے بازو جن کے ارجن کی کمان کھینچنے والے
لہم سمر عوال عند اقدام باھوالی

کئی پشتوں سے اس کی تیغ ہے اسلام کی حامی
کموج فی غماما لحرب جیاشٌ خیالی

دعا گویوں تو سب آصف کے تھے مشرق سے مغرب تک
مسلماں اور ہندو اور کشمیری و بنگالی
مگر یہ انتخاب ایسا زمانے کو پسند آیا
کہ سب نے شاہ آصف کی غلامی کی قسم کھائی

مہاراجہ بہادر کے جد امجد مہاراجہ چندو لال تخلص بہ شاداں کی سخاوت سارے ہندوستان میں مشہور تھی لوگ حیدرآباد کو چندو لال کا حیدرآباد کہتے تھے سخاوت کی یہ صفت مہاراجہ بہادر میں بھی بدرجہ اتم موجود تھی جب شہر کی سڑکوں پر سواری نکلتی تو مہاراجہ بہادر چاندی کے سکے دو رویہ پھینکتے ہوئے جاتے تھے۔ مہاراجہ کی تعلیم و تربیت اپنے نانا نریندر بہادر کی نگرانی میں ہوئی۔ خطاطی، اردو، فارسی، عربی، ہندی اور سنسکرت کی تحصیل الگ الگ استادوں سے کی فن سپہگری میں جو آبائی پیشہ تھا بڑی مہارت پیدا کی۔ بنوٹ، تیر اندازی اور شہ سواری میں کمال حاصل کیا۔

اردو، فارسی ادب شعر و سخن سے اس قدر دلچسپی بڑھی کہ ہندوستان کے مشہور ادیبوں اور شاعروں سے مراسلت شروع کر دی اقبال، اکبر، حسن نظامی، ظفر علی خاں، عماد الملک اور مولانا حالی کو خطوط لکھتے تھے ایک مکتوب موسومہ شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

" یہ ظاہر ہے کہ آپ سے مجھ کو تعارف نہیں ہے اور آپ روشناس نہیں مگر میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ کان دھر کر سننے میں نے آپ کی تصنیفات سے دو کتابیں دیکھیں "حیات سعدی" (بارک اللہ)

دوسری "یادگار غالب" (سبحان اللہ) مجھ میں نہ اسقدر استعداد ہے نہ قابلیت کہ آپ کی تعریف کروں مگر یہ ضرور کہونگا کہ یہ دونوں کتابیں انمول ہیں اور آپ کا دم مغتنمات سے ہے خدا چشم حوادث سے بچائے اب سنئے کہ جس حالت میں آپ کو اور مجھے غالب مرحوم کے ساتھ ایک دلی تعلق اور اسی دلی تعلق کی بدولت آپ کی دلچسپ تصنیفات نے مجھے اس بیگانگی میں بے تکلف کردیا تو یہ ذریعہ تعارف کرنے کے لئے بالکل کافی ہے کاش ابھی غالب مرحوم نہ مرتے یا اُنکی حیات میں میں ذی شعور ہوتا ۔

زندہ جو کہیں ہوتے ابھی حضرت غالب   اے شاد ترے دل کی تمنا بھی بر آتی

مولانا حالی سے ارتباط و اعتقاد بڑھتا گیا اور علم و ادب کی تشنگی کا یہ عالم تھا کہ مولانا حالی سے ملنے کے لئے پانی پت جیسے دور دراز مقام کا سفر اختیار کیا اور وہاں پہنچکر جی بھر کر ملاقاتیں کیں اور شعر و سخن سے معمور محفلوں کی یاد لیکر وطن کو مراجعت کی ۔

اردو زبان و ادب کی جتنی عظیم خدمت مہاراجہ بہادر نے کی شاید ہی کسی اور نے انفرادی طور پر کی ہو بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ نیوارجی میں ضیا برج کی سی کیفیت پیدا ہے ۔ انہوں نے شاعروں نالوں کی سرپرستی کرکے ہزاروں لاکھوں روپئے کا صرفہ برداشت کیا ہندوستان کا کوئی مشہور اہل قلم ایسا نہیں تھا جس نے مہاراجہ بہادر سے وابستگی پیدا نہ کی ہو آخر زمانے میں فانی بدایونی اور جوش ملیح آبادی بھی مہاراجہ بہادر کے دامن سے وابستہ تھے ۔ مہاراجہ بہادر اپنے دور مدار المہامی میں مشاعرے منعقد کرتے تھے یہ زمانہ میرے بالکل بچپن کا تھا لوگوں سے

سنا کہ ان مشاعروں میں ضیاء گورگانی امیکش، ترکی، ظہیر، برتر، میرزا داغ وغیرہم شریک ہوتے تھے ایک مشاعرہ کا واقعہ چشم دید ایک صاحب نے بیان کیا کہ مہاراجہ بہادر کی صدارت میں مجلس شعرا تھی وابستگان شاد میں سے ظہیر دہلوی شاگرد ذوق دہلوی جو میرزا داغ دہلوی کی وفات کے بعد استاد شاہِ دکن مقرر کئے جانے کے امیدوار تھے شریک مجلس تھے لیکن آپ کو ذیابیطس کی شکایت تھی بار بار استنجا کی حاجت ہوتی تھی اسلئے مشاعرہ سے اٹھکر چلے گئے اور واپس نہیں آئے یہ امر مہاراجہ بہادر کو ناگوار ہوا یہاں تک کہ حضور نظام کے پاس میرزا داغ کی جگہ پُر کرنے کے لئے نواب فصاحت جنگ جلیل جانشین امیر مینائی کا نام پیش کردیا اور ظہیر کی توقعات پر پانی پھر گیا۔ حضور نظام نے جلیل مرحوم کی شعری [illegible] کی بڑی قدر فرمائی اور انہیں فصاحت جنگ کا خطاب [illegible] امام الفن کا لقب عطا کیا اور ایک ہزار روپیہ ماہانہ مشاہرہ مقرر فرمایا۔

مہاراجہ بہادر کے دور صدارت عظمیٰ میں بھی بڑے زور و شور کے مشاعرے منعقد ہوتے تھے ہر مہینہ اردو فارسی کے مصرعہ طرح کے دیئے جاتے تھے جن پر شعرا طبع آزمائی کرتے ان مشاعروں میں راقم بھی مدعو ہوتا تھا کسی مشاعرے میں نہ جاتا تو مہاراجہ بہادر مجھ سے پوچھتے خیریت تو ہے گذشتہ مشاعرے میں آپ نہیں آئے اللہ اللہ کیا وسیع المشرب اور وسیع القلب بحر طلب اور خیر اندیش ہستیاں تھیں کہ غریب سے غریب شخص کے ساتھ بھی تعلق خاطر رکھتی تھیں ایک عید الفطر کے موقع پر مہاراجہ بہادر نے عطر آگرکہنہ اور ایک فون نین پن

تحفتہً راقم کو عطا فرمایا۔ اس سے پہلے اپنی تمام تصنیفات و تالیفات اسٹیٹ کے معتمد ڈھونڈے راؤ کے ہاتھ بھیج کر سرفرازی فرمائی ہر کتاب پر "فقیر کشن پرشاد" بدست خاص لکھا تھا۔ افسوس ہے کہ مشاعروں کی رودادیں کسی نے نہیں لکھیں یہ یادگار ادبی محفلیں اس قابل تھیں کہ انکی یاد اسیر کرلی جاتی۔ شرکائے مشاعرہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے شاہ ظفر کے درباری مشاعروں اور مٹیا برج کے شعر و سخن کی مجلسوں کا حال تذکروں میں پڑھا ہے لیکن ایسے ہی مشاعرے ہم مہاراجہ بہادر کے ایوان میں دیکھ رہے ہیں مشاعروں میں جو شعرائے کرام آتے تھے ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) نواب لطف الدولہ لطف (۲) نواب وحید الدین وحید
(۳) نواب نجم الدین نجم برادران لطف (۴) نواب ضیا یار جنگ ضیا
(۵) نواب عزیز یار جنگ عزیز (۶) نواب اصغر یار جنگ اصغر
(۷) نواب نثار یار جنگ مزاج (۸) راجہ نرسنگ راج عالی
(۹) حکیم الطاف احمد آزاد انصاری (۱۰) فانی بدایونی (۱۱) جوش ملیح آبادی
(۱۲) آقائے فرخ شیرازی (۱۳) آقائے سید محمد علی نامی (۱۴) گورسرن بلی زار
(۱۵) عبد الصمد آصفی (۱۶) عبد السلام ذکی (۱۷) حبیب الدین صغیر
(۱۸) عبد اللہ خاں کامل (۱۹) عبد المجید مجید (۲۰) مسعود علی محوی
(۲۱) عبد المقتدر خاں ناظم (۲۲) علامہ عبد اللہ العمادی آخر الذکر کسی خاص مشاعرہ میں تشریف لاتے تھے۔

اکتوبر ۳۰ء میں پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی حیدرآباد آئے تھے ان کے اعزاز میں مہاراجہ بہادر نے مشاعرہ منعقد کیا تھا جس

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے طرح تھی اس مشاعرے میں شعرا کے علاوہ جس میں اکابر ملک موجود تھے۔ غالباً یہ اخیر مشاعرہ تھا جس میں نظم علامہ طباطبائی نے شرکت کی اور غزل پڑھی اس کے بعد مشاعروں میں جانا ترک کر دیا تھا۔

مہاراجہ بہادر شعرا کی کبھی طعام ضیافت کرتے کبھی فواکہات سے تواضع کرتے ایک ضیافت کا حال سنئے ایوان شاد میں مجلس شعر منعقد ہوئی تیس کے شعرا اور دس سخن فہم موجود تھے۔ سفید چاندنیوں کا فرش اس پر سرخ کپڑے کا دستر خوان بچھا تھا شعرا صاحب دستر خوان پر بیٹھ گئے میں اخیر کونے میں تھا مہاراجہ بہادر نے ہر سمت نظر دوڑائی اور پوچھا کہ راشد صاحب کہاں ہیں میں اپنی جگہ سے اٹھ کر آداب بجالایا تو فرمایا یہاں آئیے یعنی اپنے سامنے۔ جب میں آیا تو روبرو جگہ نکالی گئی فرمایا کہ بیٹھئے اس اعزاز کے واسطے دوبارہ کورنش کی اور بیٹھ گیا۔ کھانا شروع ہوا نواب ضیا یار جنگ نے جو مہاراجہ بہادر کے بازو بیٹھے ہوئے تھے بگھارے بیگن کا کٹورا میری طرف کو بڑھایا میں نے کہا کہ کھٹا نہیں کھاتا اور کٹورا لوٹاتے تو یہ لقائے تو کہہ کر واپس کر دیا اس پر ضیا نے مہاراجہ بہادر کو مخاطب کیا کہ میں ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ عبدالرزاق راشد ملکی نہیں ہیں کیونکہ یہ بول چال لب ولہجہ اور طرز تحریر سے غیر ملکی معلوم ہوتے ہیں آج اس کا قطعی ثبوت مل گیا کیونکہ راشد کھٹا نہیں کھاتے ضیا کے کے نزدیک جو شخص کھٹا نہ کھائے وہ ملکی نہیں ہو سکتا۔ اس پر حاضرین میں ایک قہقہہ پڑا اور سب مصروف تناول طعام ہوئے۔ کھانے کے بعد مشاعرہ شروع ہوا اور (۱۱) بجے شب کو ختم ہوا۔ مہاراجہ بہادر کی آمنی

شفقت و عنایت مجھ پر تھی اور اس قدر اعتماد تھا کہ بعض امور میں رائے طلب فرماتے تھے میرے ذہن ناقص میں جو بات آتی اسی وقت عرض کر دیتا بمصداق

حافظا وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس
در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

ایک روز فرمایا کہ دفتر میں مشاہیر ادب کے خطوط ہیں ان میں سے جو قابل اشاعت ہوں ان کو چھپوا دینا چاہیئے اور اسی وقت منتظم دفتر سید صادق حسین غبار صاحب کو طلب کر کے حکم دیا کہ مشاہیر کے جو خطوط دفتر میں ہیں راشد صاحب کو دیجئے۔ غبار صاحب پر کاہلی مستولی تھی مجھے مہینے کے بعد چند خطوط بہت جبر سے تقاضا کرتا کہ جملہ خطوط لے آیئے تو کہتے کہ ڈھونڈھ رہا ہوں دستیاب ہوتے ہی پیش کرونگا باعث یہ تھی کہ دفتر میں بے ترتیب سینکڑوں کاغذات رسالے اخبارات مسلیں پڑی ہوتی تھیں اور اس انبار میں سے خطوط کا الگ کرنا واقعی کارے دارد کا مصداق تھا کئی مہینے گذر گئے بقیہ خطوط نہیں ملے جو ملے وہ اقبال اکبر حسن نظامی ظفر علی خاں عماد الملک کے نوشتہ تھے جب مہاراجہ بہادر کی وفات واقع ہوئی اسٹیٹ کے ناظم مرزا محمد بیگ صاحب مقرر ہوئے جن کی مساعی جمیلہ سے بہت سے خطوط برآمد ہوئے جنکو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بانی ادبیات اردو نے شاد و اقبال کے نام سے شائع کر دیا ہے

۴

میرزا آسماں جاہ انجم خلف نواب واجد علی شاہ تاجدار اودھ

میرزا آسماں جاہ متخلص بہ انجم علامہ کے سب سے پہلے شاگرد تھے جب علامہ

کلکتہ چھوڑ کر حیدر آباد آگئے تو آپ کو استاد کی مفارقت کا بڑا صدمہ ہوا آپ کا ایک خط علامہ کو موصول ہوا تو اس کا یہ جواب ملا۔

"آپ کا نوازشنامہ عرصہ کے بعد آیا میں کسی سے خط نہ لکھنے کی کیا شکایت کروں جب اپنی خود فراموشی و کاہلی سے شرمندہ ہوں کہ ہمیشہ قاصر رہتا ہوں بخلاف مجھے کوئی خط لکھتا ہے تو میں جانتا ہوں کہ مجھ پر احسان کیا ورنہ میں اس قابل نہیں کہ کوئی بھول کر بھی یاد کرے آپ کے خط میں صاحب عالم بہادر کا سلام دیکھکر نہایت شرمندگی ہوی کہ مدت سے اُن کی خدمت میں عریضہ نہیں لکھا اس وقت چاہتا تھا کہ عریضہ لکھوں مگر پتہ نہیں معلوم میری طرف سے بہت بہت تسلیمات و شوق ملاقات معروض کیجئے اور پتہ لکھ بھیجئے۔" پتہ آیا تو صاحب عالم کو ایک خط لکھا اس کا ابتدائی حصہ تلف ہوگیا باقی ماندہ تحریر یہ ہے۔

"......عجب طرح بسر ہو رہی ہے کلکتہ میں ہمیشہ لکھنو کو یاد کیا اب حیدر آباد میں کلکتہ یاد آتا ہے وہاں کے احباب جو اکثر غریق رحمت و کشتہ حسرت ہوگئے آنکھوں کے سامنے پھرا کرتے ہیں رفتہ رفتہ وہ صحبتیں گنجفہ کی طرح ابتر ہوگئیں میں حیران ہوں کہ لکھنو کو وطن سمجھوں یا کلکتہ کو یا حیدر آباد کو۔

گھر کو چھوٹے ہوے مدت ہوی صیاد مجھے
کس چمن میں تھا نشیمن یہ نہیں یاد مجھے

میرا بھی ایک آدھ شعر ایسا ہی ہے۔

اب نہ گلشن ہے نہ اپنے آشیانہ کا پتا
کچھ بگولا اٹھ کے دیتا ہے نشاں صیاد کا

اے اجل آئی ہے کس ہنگام تنہائی میں تو

دینے والا بھی نہیں کوئی مبارک باد کا

آپ کے دوست شاد و دشمن نامراد بحق النبی و آلہ الامجاد

عریضہ خیر اندیش عقیدت کیش

سید علی حیدر

ایک خط میں علامہ نے کلام انجم طلب کیا تو انجم کی طرف سے یہ جواب موصول ہوا۔ از طرف آسماں جاہ

بھولے سب بھول کر شاد کیا — یاد کیا آگیا جو یاد کیا

اشتیاق دل کو اس خط سے — یوں ہی کیا کم تھا جو زیاد کیا

پڑھتے ہی خط ٹپک پڑے آنسو — ہم نے یاد آوری پہ صاد کیا

"مہربانا۔ میرے کلام کا اشتیاق جو آپ نے ظاہر فرمایا یہ سب آپ کا فیض صحبت ہے اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست ورنہ من آنم کہ من دانم ع

جمال ہم نشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

گر بموجب طلب کے جو کچھ بھلا آپ ہی کا بتایا ہوا تکلم کیا ہے بھیجتا ہوں اب نہ کہیں بھول جائیگا یہ غزلیں فقط دیکھنے کے واسطے نہیں بھیجی ہیں بلکہ ان کو بنا کر واپس کیجئے۔

آپ کا بہی خواہ

مرزا آسماں جاہ

علامہ نے جواباً یہ خط اور اس کے نیچے مدحیہ اشعار لکھ بھیجے،

"بحضور صاحب عالم و عالمیان ادام اللہ تعالیٰ کم:

طغرائے نوازش و الطاف یعنی حضور پر نور کا شقہ خیر اندیش کو پہنچا

میں آپ کو اور آپ کے کلام کو کبھی بھول نہیں سکتا گو عرصہ ہوا کہ عرض کر چکا ہوں کہ آپ کو اصلاح کی ضرورت اب نہیں ان غزلوں کی تعریف میں زبان قاصر ہے بجا آوری حکم کے خیال سے ایک آدھ لفظ کہیں کہیں بنا دیا ہے حضور تو شعرائے حال کے متعدد متروکات کو قابل قبول نہیں سمجھتے۔"

خیر خواہ بلا اشتباہ

علی حیدر نظم طباطبائی

صبح سے شب کیے دل کو شاد کیا — اشک کو گوہر مراد کیا
شعر یہ تیرے آزین نشتر تھے — درد دل اور بھی زیاد کیا
ناسپاسی کی جس قدر میں نے — التفات اس قدر زیاد کیا
کس بے کسی پہ ترے کرم کی ادا — بندۂ بے وفا کو یاد کیا
ظلم کو علم سے قریں رکھا — دولت و دیں میں اتحاد کیا
سالک منزل یقیں رکھا — مالک ملک عقل و داد کیا
شیخ کو برق و رعد گردانا — فیض کو تیرے ابر و باد کیا

تجھ کو اصلاح کی کیا ضرورت ہے
نظم کو تیرے طبع زاد کیا

انجم نے خط کے ساتھ جو تین غزلیں بھیجی تھیں ان میں سے دو غزلیں درج ذیل ہیں:-

— ۱ —

وہ چال اٹکھیلیوں سے چل کر دل و جگر روندے ڈالتے ہیں
ابھی جوانی کا ہے جو عالم نہ دیکھتے ہیں نہ بھالتے ہیں
اگر یہی ہے تلون ان کا خدا ہی ہے وعدہ ہو جو پورا
کہا تھا کل آج وصل ہوگا وہ آج پھر کل پہ ٹالتے ہیں

کبھی یہ کہتے ہیں درد سر ہے کبھی یہ کہتے ہیں اب سحر ہے
ستم یہ مشتاق وصل پہ ہے ہزاروں حیلے نکالتے ہیں

کسی کے انجم جو ہے سکھائے تو ہے نیا رنگ آج لائے
کہ چپکے ہیں سر جھکائے نہ بولتے ہیں نہ چالتے ہیں

(۲)

الٰہی کوئی ہوا کا جھونکا دکھا دے چہرہ اڑا کے آنچل
کہ جھانکتا ہے وہ سرنگر تو کمر ٹکڑی میں لگا کے آنچل

ضرور ڈھلائے گا کوئی فتنہ ضرور فتنہ بپا کرے گا
یہ تیرا اٹھیلیوں سے چلنا جھکا کے گردن اٹھا کے آنچل

تمہیں سے ہے منظور گر بپھرنا تمہیں کہو کر یہ کیسا عبا نا
جتا کے غصہ سنا کر باتیں چڑھا کے تیوری چھڑا کے آنچل

زمانہ فرقت کا جائے یارب وہ دن بھی آئے یارب
ادا کروں میں تما دوپٹا کھڑے رہیں وہ بچھا کے آنچل

سنی جو پاؤں کی میری آہٹ تو جاگے چپکے سے سو رہے وہ
جو میں نے تلووں میں گدگدایا الٹ دیا مسکرا کے آنچل

ضرور ہیں کچھ نہ کچھ کشیدہ کہ رہتے ہیں دور دور مجھ سے
جو پاس بھی آ بیٹھتے ہیں تو زیر زانو دبا کے آنچل

یہ تیرا بوٹا سا قد قیامت یہ چال متوالی آفت آفت
یہ پیاری صورت ستم دوپٹہ غضب کی رنگت بلا کے آنچل

سمجھ لے یہ دل میں آسمان تو وہ لوٹتے ہیں تیرے لٹنے پر
جو اوڑھ کر لٹ پٹا دوپٹہ لٹا گئے ہیں ادا کے آنچل

مرزا آسماں جاہ پہلے آسماں تخلص کیا کرتے تھے علامہ نے انجم تخلص پسند کیا اس لئے انجم لکھنے لگے اور جن اشعار میں آسماں تخلص آیا اس کو بجنسہ رہنے دیا۔

مشاہیر سے ملاقاتیں

ہندوستان کے شمال و جنوب اور مغرب و مشرق سے جو شعرا ادبا یا مدیران اخبارات و رسائل حیدرآباد آتے علامہ کی ملاقاتوں سے بہرہ اندوز ہوتے علامہ نے حسرت موہانی، تاجور نجیب آبادی، نصیر حسین خاں خیال وغیرہم کی ضیافتیں کی تھیں جو اصحاب ملتے علامہ کے فضل و کمال کا اعتراف کرتے اور علامہ کی خوشگوار یادیں لیکر جاتے: مسز سروجنی نائیڈو گورنر اتر پردیش علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتیں اور اپنی انگریزی نظموں کے ترجموں کی خواہش کرتیں چنانچہ ایک دو ترجمے "نظم طباطبائی" میں چھپے ہیں

سنہ ۱۹۱۰ء میں سر اکبر حیدری مرحوم سکریٹری دولت آصفیہ کی دعوت پر سر اقبال حیدرآباد آئے اور انھیں کے مہمان رہے میں اس زمانے میں علامہ سے دیوان غالب سبقاً سبقاً پڑھ رہا تھا ایک روز جبکہ میرا سبق چل رہا تھا اقبال علامہ سے ملنے آگئے، علامہ نے گرمجوشی اور تپاک سے استقبال کیا پہلے اقبال کی خاطر تواضع کی پھر دونوں میں علمی و ادبی گفتگو شروع ہوئی دوران گفتگو میں علامہ کی باتیں سنتے ہوئے اقبال "جی ہاں جی ہاں" کی بجائے "ہاں جی ہاں جی" کہتے جاتے تھے یہ بات چیت ختم ہوئی تو اقبال نے علامہ سے کلام سننے کی فرمائش کی، علامہ نے قصیدہ غزوہ بدر سے چند شعر سنائے اور اقبال سے کہا کہ آپ کچھ پڑھیں اقبال نے نظم سنائی

جس کا مطلع یہ ہے :-

اجالا ہوا رخصت جبین شب کی افشاں کا
نسیم زندگی پیغام لائی صبح خنداں کا

اس کے بعد اقبال کی خواہش پر علامہ نے عہد نواب واجد علی شاہ تاجدار اودھ کے حالات و واقعات بیان کئے جن کو سنکر اقبال مسرور و مطمئن ہو کر واپس گئے اور دوسرے ہی دن عازم لاہور ہوئے علامہ نے جو قصیدہ سنایا تھا اسی کی زمین میں اسی موضوع یعنی طلوع سحر پر اقبال نے بھی فکر کی اور چند شعر کہے جو رسالہ مخزن لاہور میں چھپے دونوں شاعروں کی نظمیں ملاحظہ ہوں ۔

علامہ نظم طباطبائی

کیا اشارہ کر رہی ہے دیکھ چشم روزگار
کیا ترا سے بھر رہا ہے ابلق لیل و نہار

پردۂ ظلمت سے نکلا رخ سلمائے سحر
ناقۂ گردوں کی کھینچی لیلیٔ شب نے مہار

ہے شفق یا وادیٔ فیروزہ گوں میں لالہ زار
ہے سحر یا سبزہ زار آسماں میں آبشار

چاہ سے نکلے ہیں یوسف یا ہے تارا صبح کا
یا بنا گوش زلیخا میں ہے در شاہوار

آفتاب آیا نظر سے زر گریبان افق
ہو گئی تمائے شب یا ہو گئی صبح آشکار

آتش افروزی جو کی مشرق میں آ تیمور نے
ہو گیا مغرب میں پنہاں بسا جو نار مار

آسمان شعبدہ گر نے یہ کی افسوں گری
مہرۂ شرق میں اگل کر چھپا مغرب میں مار

یہ سحر ہے یا کرشمہ رنگ رخ عذرائے چرخ
یہ شفق ہے یا کہ ہے خون رگ ابر بہار

ہو گیا فیض سحر سے چنبر گردوں چنگیر
بن گئی لطف ہوا سے کہکشاں پھولوں کا ہار

حور کا دست نگاریں ہے کہ ہے کف الخضیب
آرسی ہے یا نظر آتا ہے یہ رنگ عذار

خوشۂ گندم ہے یہ سنبل کف عذرا میں ہے
گوندھنے کو ہاتھ میں لی ہے زلف مشکبار

نور کا جلوہ دکھاتی ہے یہ صبح جانفزا
جس کے گھونگٹ سے ہویدا ہے سحر کا آشکار

قرنی الشمس ایکے زیر پا ہیں موجیں نور کی
نکلی ہے چادر سے آئینے کی یہ سیمیں عذار

چشمۂ خورشید میں غوطہ لگائے گی یہ پھر
گنبد نیلوفری پر کوئی دم ہے یہ قرار

آنکھ ابھی محوِ تماشا تھی کہ بجھ کر رہ گئے
یا الٰہی جلوۂ انجم تھا یا رقصِ شرار

صبح ہوتے خیمۂ زنگار گوں آیا نظر
تھا طلسم سیمیائی گنبد گوہر نگار

حصن خاور میں ہوئی فوج کواکب جاگزیں
ہوگیا لشکر پہ غالب ایک ترک نیزہ دار

پھینکتی بام گردوں پر کمند اپنی کرن
کرتا ہے تیر شعاعی نسر طائر کو شکار

ڈاکٹر سر اقبال

ہو رہی ہے زیر دامان افق سے آشکار
صبح یعنی دختر دوشیزۂ لیل و نہار

پا چکا فرصت درود فصل انجم سے سپہر
کشت خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار

آسماں نے آمد خورشید کی پا کر خبر
محمل پرواز شب باندھا سر دوش غبار

شعلۂ خورشید گویا حاصل اس کھیتی کا ہے
بوئے تھے دہقان گردوں نے جو تاروں کے شرار

ہے رواں نجم سحر جیسے عبادت خانے سے
سب سے پیچھے جائے کوئی عابد شب زندہ دار

کیا سماں ہے جس سے آہستہ آہستہ کوئی
کھینچتا ہو میان کی ظلمت سے تیغ آبدار

مطلع خورشید میں مضمر ہے یوں مضمون صبح
جیسے خلوت گاہ مینا میں شراب خوشگوار

ہے تہ دامان باد اختلاط انگیز صبح
شورش ناقوس آواز اذاں سے ہم کنار

جاگے کوئل کی اذاں سے طائران نغمہ سنج
ہے ترنم ریز قانون سحر کا تار تار

تصنیفات و تالیفات تراجم | (۱) تشریح الافلاک - یہ شرح شیخ بہائی کی ہے

مٹیا برج میں لکھی گئی اور مسٹر کرافٹ ناظم تعلیمات کے نام معنون کی گئی۔

(۲) تعریب الاطفال۔ یہ کتاب مٹیا برج میں شہزادگان اودھ کو عربی آسانی سے سیکھنے کے لئے تصنیف کی گئی۔

(۳) معربات۔ تعریب الاطفال کی طرز پر عربی زبان میں لکھی گئی ہے۔

(۴) بینات۔ یہ بھی عربی میں ہے اس کی فرہنگ بھی لکھی ہے اور کتاب کے خصائص بیان کئے ہیں کہ "کچھ سوا اصطلاحات جو نحویوں نے بنائے تھے اور ان کے سب تعریفات جن کے سمجھنے میں جیل کی زبان تمام ہے اور جن کے یاد کرنے میں الفاظ ادبیہ کا یاد کرنا رہ جایا کرتا ہے وہ سب چھوڑ دئے فقط مسائل سے کام رکھا۔ زبان عربی میں جو خصوصیت ہے کہ بے صرف پڑھے ہوئے الفاظ صحیح پڑھنا اور بغیر نحو کے جملہ کا صحیح پڑھنا نہیں ممکن ہے اس سبب سے بچوں کو۔ تو صرف پڑھنا پڑتی ہے اور نحو کے انتظار میں ادب شروع نہیں کر سکتے اور یہ دونوں فن حاصل ہونے تک زبان سیکھنے کا سن گزر جاتا ہے اس خیال سے میں نے صرف و نحو کے مسائل میں ربط دیا اور جس طرح تحریر و تقریر میں دونوں کا ساتھ رکھا جس کا کچھ نمونہ تعریب الاطفال میں ہے۔ صرف و نحو میں ربط دینے سے یہ فائدہ ہوا کہ ادب کا پڑھانا بھی اس کے ساتھ ہی ساتھ شروع کر دیا جہاں تک ہو سکا مثالیں ہر جگہ کثرت سے دی ہیں جس کے ضمن میں (۹۰) شعر جو اہل ادب کے زبان زد ہیں اور (۶۴) حکایتیں دوسری کتاب میں آگئیں اور

وہی حدیث و آیت اور وہی شعر و حکایت مثال میں لکھے جس کے سب مبتدی طلبہ پہچان سکیں اور وجوہ اعراب کو جان سکیں فقط معنی استاد سے پوچھ لیں۔

مسائل کے ذہن نشین کرنے کے لئے نحو عربی کو جہاں جہاں نحو اردو کے ساتھ موافقت یا مبائیت ہے وہ بیان کر دی۔

ضروری مسئلوں کے انتخاب اور اختصار کو سمجھا کر بیان کرنے میں یہ کتاب منفرد ہے اور چھپنے سے پیشتر کئی دفعہ میں اسے پڑھا چکا ہوں اور اس کا نفع تجربہ میں آچکا۔ باوجود ان سب قیود کے مسائل کی جو ترتیب قدیم ہے اس میں بھی کچھ زیادہ فرق نہیں آنے پایا۔ مبنیات میں زحمت اعراب کی نہیں ہے اس سبب سے تعلیم مبنیات کو معربات پر مقدم رکھا۔"

(۵) تلخیص عروض و قافیہ۔ فن عروض پر لکھی گئی ہے اس میں دقیق و پیچیدہ مسائل تشنگان فن کے لئے بدرجہ غایت آسان کر دیئے گئے ہیں علامہ لکھتے ہیں "میں نے تلخیص عروض ایک عجیب و غریب رسالہ لکھا ہے۔"

(۶) نظم طباطبائی (قصیدوں نظموں اور ترجموں کا مجموعہ)
علامہ اس کتاب کے مقدمے کے حاشیے پر لکھتے ہیں کہ "جو لوگ صاحب نظر ہیں ان سے امید ہے کہ اس جزو کو نظم اردو کا بہترین نصاب سمجھیں گے" یہ کتاب صحت زبان و محاورہ و انداز بیان کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتی ہے اور ادبا کو فن کو نئی راہیں دکھاتی ہے اور ثبت است برجریدہ عالم دوام کا نقارہ بجاتی ہے۔

(۷) صوت تغزل غزلوں اور رباعیوں کا مجموعہ

علامہ لکھتے ہیں "یہ سب غزلیں مشاعروں کی ہیں یا گلدستوں کی طرحوں میں یا بعض احباب کی فرمائشی زمینوں میں۔ میں خود سے کبھی غزل نہیں کہتا"

میرے نزدیک علامہ کی غزلوں سے قصیدوں اور نظموں کا مرتبہ بلند ہے لیکن بعض غزلیں معرکہ کی لکھی ہیں۔ صوت تغزل میں علاوہ اردو غزلوں کے فارسی غزلیں بھی شریک ہیں۔ برسوں پہلے دیوان کا آدھا حصہ حسرت موہانی نے رسالہ اردوئے معلےٰ میں شائع کیا تھا جس کی کما حقہ قدر نہیں کی گئی۔

(۸) تاریخ طبری کا ترجمہ۔ اس کے ۵ باب رسالہ تحفہ حیدرآباد دکن صفر تا ذی حجہ ۱۳۲۵ھ میں چھپے ہیں۔

(۹) تاریخ شول کے چار باب کا ترجمہ جسے مولانا عبدالماجد دریاآبادی چھوڑ گئے تھے۔

(۱۰) مستطرف کا ترجمہ۔ حسب فرمائش رائٹ آنریبل امیر علی مصنف تاریخ اسلام۔

(۱۱) امراض کے سہل نسخے اور فوری تدابیر۔ انگریزی کتاب مصنفہ محمد مولانا ساکن وزیگاپٹم کا اردو ترجمہ۔ غالباً اسی کتاب پر تقریظ لکھی ہے جو آگے آئیگی۔ علامہ تبدیل آب ہوا کے واسطے والٹیر اور وزیگاپٹم گئے تھے وہاں محمد مولانا سے ملاقاتیں رہیں انہوں نے ترجمہ کی فرمائش کی علامہ انگریزی کتاب اپنے ساتھ حیدرآباد لائے اور ترجمہ کر کے محمد مولانا صاحب کو بھیج دیا۔ انہوں نے

چھپوایا یا نہیں معلوم نہیں ہو سکا۔

(۱۲) انتخاب بیدل۔ شرح بیدل لکھنے کے ارادے سے انتخاب کیا تھا اس کا مسودہ دستیاب نہیں ہوا۔

(۱۳) تذکرہ شعرائے فارسی۔ اس کا مسودہ دستبرد زمانہ کی نذر ہوا فقط ظہیر فاریابی اور مولانا جلال الدین رومی کا مختصر حال اور منتخب کلام محفوظ ہے۔

(۱۴) سلام اور مرثیے (غیر مطبوعہ) ایک مرثیہ سو بند کا رباعی کے وزن میں الطاف حسین زنگین کی مجلس میں سنایا تھا۔

(۱۵) ترجمہ تاریخ یورپ حصہ اول۔

(۱۶) شرح دیوان اردوئے غالب۔ جن دوسرے اہل قلم نے شرحیں غالب کی لکھی ہیں انکی تصریح درج ذیل ہے:۔

(۱) شرح خواجہ راقم دہلوی۔ راقم غالب کے بہت قریبی رشتہ دار تھے۔ ان سے شرح چھپوانے کے لئے نواب ذوالقدر جنگ ہوم سکریٹری حیدرآباد نے لی تھی مگر مدت تک یوں ہی پڑی رہی شاید ضائع ہو گئی۔

(۲) وثوق صراحت مصنفہ مولانا عبدالعلی والہ پروفیسر نظام کالج۔ یہ شرح مکمل نہیں ہے مشکل الفاظ کے معنی اور مختصر اشارے مطالب کے باب میں ہیں۔

(۳) وجدان تحقیق۔ مصنفہ عبدالواجد فرزند مولانا عبدالعلی والہ۔ اگر بہ تو اندیسر تمام کند کے مصداق مولانا عبدالواجد نے شرح غالب تفصیل سے لکھی ہے۔ موصوف سٹی ہائی اسکول میں

مجھے فارسی پڑھاتے تھے اور ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "میری تنخواہ تھوڑی ہے اور کام بہت ہے" طلبہ اس قول کو دہرایا کرتے تھے جب انھیں مذاق سوجھتا۔

(۴) حل غالب مصنفہ سید مرتضیٰ بیان آن یزدانی میرٹھی۔ بیان ایک ہوار رسالہ لسان الملک نکالتے تھے اشعار غالب کا حل چیدہ چیدہ اسی رسالے میں شائع ہوتا تھا شرح پوری ہوئی یا ادھوری اسکا علم نہ ہو سکا۔

(۵) شرح غالب مصنفہ سید احمد حسین شوکت میرٹھی جو اپنے آپ کو مجدد السنہ مشرقیہ لکھا کرتے تھے کسی رسالہ کے ایڈیٹر تھے اس زمانے کے اخباروں اور رسالوں میں آپ کے بلند بانگ دعوے شائع ہوتے تھے کہ ان کی مانند کوئی شخص عرفی خاقانی اور غالب کے اشعار کو نہیں سمجھا جا سکتا اس شرح میں بہت سے اشعار حذف کئے ہیں اور کلام غالب پر غلط اصلاحیں دی ہیں۔

(۶) مطالب الغالب۔ مصنفہ مولانا سہا (علیگ)

(۷) شرح غالب مصنفہ مولانا فضل الحسن حسرت موہانی۔
یہ شرح مختصر اور مفید ہے مولانا اعتراف کرتے ہیں کہ شرح طباطبائی سے استفادہ کیا ہے۔

(۸) مرآۃ الغالب مصنفہ مولانا بیخود دہلوی۔

(۹) شرح غالب مصنفہ احسان بن دانش۔

(۱۰) شرح غالب مصنفہ محمد سعید۔

(۱۱) بیان غالب آغا محمد باقر دہلوی نبیرہ شمس العلما آزاد دہلوی۔

(۱۲) مشکلات غالب مصنفہ نیاز فتحپوری۔ رسالہ نگار لکھنو میں
ہر مہینے اشعار غالب کا حل نکلتا رہا ہے۔

(۱۳) مکمل شرح غالب مصنفہ مولانا عبدالباری آسی لکھنوی، آسی نے
یہ کہکر کہ کسی کی بیاض سے چند غزلیں غیر مطبوعہ غالب کی دستیاب
ہوی ہیں رسالہ نگار میں شائع کرائی تھیں جس پر بڑی رد و قدح
ہوئی اور اصحاب ذوق نے الحاقی تصور کیا۔ غالب نامہ کے
مصنف مولانا شیخ محمد اکرام نے بھی غالب کی ان غزلوں کو
غالب کے نتائج طبع ماننے سے انکار کیا ہے اور مجھے کو شیخ صاحب
سے کامل اتفاق ہے مگر تحقیق ہونی چاہیے کہ آخر یہ الحاقی غزلیں
کس نے تصنیف کی ہیں۔

(۱۴) شرح غالب مصنفہ جوش ملسیانی۔

(۱۵) شرح غالب مصنفہ مولانا ضامن کنتوری ایڈیٹر رسالہ استبصار
بریلی و رسالہ لسان الملک حیدرآباد (غیر مطبوعہ)

(۱۶) شرح غالب مصنفہ علامہ جمال الدین نوری پروفیسر عربی و فارسی
نظام کالج نوری نے ایک ایک شعر کی شرح دس دس صفحوں میں
کی ہے۔ اس میں خیالات کا زور عبارت کا شور قابل دید ہے
چار پانچ اشعار کی شرح رسالوں کے ذریعے منظر عام پر آئی
باقی غیر مطبوعہ ہے۔

(۱۷) شرح نظامی بدایونی۔

(۱۸) شرح قاضی سعید احمد۔

(۱۹) محاسن کلام غالب میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے بعض

اشعار کا مطلب بیان کیا ہے۔

(۲۰) مولانا حالی نے یادگار غالب میں چند اشعار کے معنی و مطالب لکھے ہیں۔

(۲۱) خود مرزا غالب نے چند اشعار کی شرح اپنے خطوط میں لکھدی ہے

(۲۲) راقم نے تین چار غزلوں کی شرح کی ہے۔

مذکورہ بالا سب شرحیں قابل قدر ہیں اور اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سب شارحین نے علم و ادب کی خدمت سرانجام کی ہے۔ سب شرحوں میں خوبیاں بھی ہیں خامیاں بھی لیکن شرح طباطبائی کی تعریف میں ملک کے تمام ادبی طبقے یکساں رطب اللسان ہیں شرح طباطبائی کو درجہ استناد حاصل ہے جس طرح دیوان غالب بے مثل ہے اسی طرح شرح طباطبائی بھی جواب نہیں رکھتی دوسری شرحوں کے مقابلے میں شرح طباطبائی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں فن شعر و سخن کے نکات و رموز اس شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے ہیں کہ ان کے مطالعہ سے اہل ذوق کے دماغ روشن ہو جاتے ہیں اور شعر گوئی کے لئے دروازے کھل جاتے ہیں۔ مولانا شبلی نے شرح کو بالاستیعاب دیکھا اور اس شعر کی "قفس میں روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم" ...... الخ شرح پڑھ کر فرمایا کہ "شرح کس لطف سے بیان کی ہے" مولانا حالی ۱۹۱۳ء میں جشن جوبلی شاہ دکن میر محبوب علی خاں شرکت کے لئے حکومت کی دعوت پر حیدرآباد آئے تھے مولوی عزیز مرزا صاحب نے مولانا سے کہا کہ نظم طباطبائی نے کلام غالب پر اعتراض کئے ہیں مولانا نے جواب دیا" غالب پر علی حیدر صاحب نے اعتراض نہیں کئے ہیں بلکہ اپنا فرض منصبی ادا کیا ہے شرح کے لئے میں

شکریہ ادا کرتا ہوں استاد مرحوم (یعنی غالب) زندہ ہوتے تو وہ بھی شکریہ ادا کرتے" مولانا حالی علامہ سے بڑے تپاک کے ساتھ ملے اور بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ میرزا داغ نے شرح کی نفیس جلد بندھوا کر آئینہ دار الماری میں رکھی اور کبھی کبھی اس کے مطالعہ سے لطف اندوز ہوتے تھے مولانا ظفر علی خاں شرح کو ہمیشہ پاس رکھتے تھے۔ غرض اس شرح کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ دیوان غالب کی ان سب شرحوں پر ضرورت ہے ایک محاکمہ کی جس پر کوئی غالب شناس ادیب قلم اٹھائیں تو غالبیات کا حجم بڑھیگا۔ بطور جملہ معترضہ میں چند ماہران غالبیات کا سرسری تذکرہ کرتا ہوں

(۱) مولانا امتیاز علی خاں عرشی مہتمم رضا لائبریری (کتب خانہ شاہی) رام پور۔ اس وقت تک آپ مکاتیب غالب' انتخاب غالب دیوان غالب اور فرہنگ غالب شائع کر چکے ہیں آپکو فنافی الغالب کہنا بجا ہوگا آپکی جستجو کا یہ عالم ہے کہ غالب کے ایک ایک شعر ایک ایک مصرع کے متعلق استفسار کرتے ہیں اور داد تحقیق دیتے ہیں۔ میرے موسومہ خطوط کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں ؂

جناب کرم۔ سلام مسنون ۲ر فروری ۱۹۴۲ء

جناب محترم سید تمکین کاظمی صاحب کی ایک گرامی تحریر سے معلوم ہوا ہے کہ مرزا غالب مرحوم کے فارسی خطوط سے متعلق جناب کے معلومات پنج آہنگ کے حدود سے آگے ہیں میں آجکل آہنگ پنجم کو تاریخی ترتیب دے رہا ہوں اور چونکہ یہ مجموعہ میرزا کی تمام فارسی مراسلت کا حاوی نہیں ہے کوشش کر رہا ہوں کہ ان کے غیر مطبوعہ خطوط بھی تلاش کر کے اس میں شامل کردوں۔

علاوہ ازیں خود چھپے ہوئے خطوں پر بھی خاصی محنت کرنا پڑی ہے ان کا متن جگہ جگہ غلط ہے باوجود تین نسخوں سے مقابلہ کر لینے کے بہت سے شکوک اب بھی باقی رہ گئے اس بنا پر مجھے تلاش ہے کہ مطبوعہ خطوں کی اصلیں یا ان اصلوں کی نقلیں دستیاب ہو جائیں تاکہ یہ باقی غلطیاں دور ہو سکیں۔

مجھے چند خطوں کی نقلیں مل گئی ہیں ان میں اور پنج آہنگ کے اندر چھپے ہوئے متن میں خاصا فرق ہے اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ میرزا صاحب نے ابتدائی مسودے جمع کر کے ان سے پنج آہنگ مرتب کی ہے اور جیسا کہ بعض اصحاب کی عادت ہوتی ہے کہ مسودے کو صاف کرتے وقت الفاظ اور فقروں میں ترمیم کر دیتے ہیں انہوں نے بھی تغیر و ترمیم اور مطالب کا اضافہ کیا ہے مگر اس اضافہ یا ترمیم کو مسودے میں درج نہیں کیا اس وجہ سے اصل اور مسودے کی عبارتیں بدل گئیں۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں میرزا صاحب کے اصل خطوں کی دستیابی کس قدر اہم ہو گی مگر ان کا ملنا بہت دشوار ہے اس لئے اگر ہمیں ان اصل خطوں کی ایسی نقلیں مل جائیں جو کسی اہل ذوق نے خود کی ہوں تو یہ بھی بڑے کام کی ہونگی۔

.... والسلام علی الاکرام

نیازمند

امتیاز علی عرشی

ناظم کتب خانہ

خط نمبر ۲ — ۲۹ / اپریل ۱۹۶۲ء — رضا لائبریری رام پور

مکرمی سلام مسنون

آج جناب نادم سیتاپوری کے ذریعے رسالہ تحفہ کی جلد ہشتم کا آٹھواں اور نواں نمبر (یعنی اس کا تراشا) ملا ہے جس میں آپ کے رشکی کی بیاض سے مرزا غالب کی ایک غزل درج کی ہے اس غزل کے تین شعر مطبوعہ دیوان میں ملتے ہیں بقیہ نسخہ میں ان تین غیر مطبوعہ اشعار میں سے تین مجھے جناب حامد حسن قادری کے ذریعے سے دستیاب ہو گئے تھے اور وہ میں نے اپنے مرتبہ دیوان کے حاشیہ میں درج بھی کر دئے ہیں مطلع اور ایک اور شعر ... ے لئے ابتک نئے تھے بہرحال آپ کی اس شہادت ... یں ان سب شعروں کو غالب کا مال قرار دیکر اپنے مرتبہ نسخے کے حصہ سوم (یادگار نالہ) میں درج کر لوں گا۔

اس وقت سوال یہ ہے کہ آپ نے ایک غیر مطبوعہ شعر کے دونوں مصرعوں کے پہلے لفظ نقل فرما دئے ہیں اور وہ یہ ہیں :-

تم نہ آؤ گے .... موت ....

اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ آپ کی دانست میں یہ شعر شائع شدہ ہیں اس لئے ان کے صرف اول لفظ کے ذکر سے پڑھنے والا پورے شعر کو پا سکتا ہے اگر آپ سے سہو نہیں ہوا ہے تو یقیناً دیوان غالب کا کوئی ایسا مطبوعہ نسخہ آپ کے پاس تھا جس میں یہ شعر مندرج تھا مہربانی فرما کر اس بارے میں میری رہنمائی فرمائیے امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر و عافیت ہوگا۔ والسلام

احقر امتیاز علی عرشی

خط نمبر ۳ ۵ ستمبر ۱۹۶۱ء رضا لائبریری رام پور

مکرم و محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا۔ شکر گزار ہوں

کیا آپ اپنی یاد پر زور دیکر اس شعر سے مطلع نہیں فرما سکتے۔

تم نہ آؤ گے .... موت ....

ممکن ہے یہ مسئلہ اس طرح حل ہو جائے ...... خدا کا شکر

ہے اب آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔ جواب کا انتظار رہیگا۔

والسلام مع الاکرام

امتیاز علی عرشی

خط نمبر ۴ رام پور رضا لائبریری رام پور

محترم مکرم۔ سلام مسنون۔ دونوں کتابیں مل گئیں نہایت شکریہ

آپ بہمہ وجوہ بخیر و عافیت ہوں۔ والسلام

مخلص عرشی

یا غالب کیا وہ شعر آپ کو یاد نہیں آیا؟

(۲) مولانا غلام رسول مہر مسلم ماڈل ٹاون لاہور۔ بساط ادب
کے اخیر مہرے ہیں آپ کی علمی ادبی ملکی و ملی خدمات کا جائزہ
لینا ضروری ہے یہ مقصد پورا ہو جائیگا اگر بھارت و پاکستان کے
ادیب یوم مہر منائیں۔ میں نے ۱۹۳۶ء میں حیدرآباد ریڈیو سے
مرزا غالب پر ایک تقریر ... نشر کی تھی جو شہر حیدر آباد کے
اخبارات و رسائل کے علاوہ شمالی ہند اور پنجاب کے پرچوں میں
شائع ہوئی تھی۔ مولانا سے میں نے ایک خط میں پوچھا تھا کہ کیا
اس تقریر کا حوالہ آپ نے اپنی کسی تصنیف میں دیا ہے اس کا

یہ جواب مرحمت فرمایا۔

مسلم ٹاؤن لاہور

۱۰ اکتوبر ۱۹۵۰ء

باسمہ سبحانہٗ

برادر مکرم۔ گرامی نامہ کے لئے شکریہ قبول فرمائیے آپ نے
جس ریڈیائی تقریر کا ذکر فرمایا ہے مجھے اس کے متعلق کچھ یاد نہیں
لیکن ابھی اپنے پبلشروں کو تاکیداً اطلاع دے رہا ہوں کہ میری
کتاب "غالب" اور "خطوط غالب" آپ کے نام بطور ہدیہ مختصر ارسال
کردیں............ آپ نے غالب کے غیر مطبوعہ
اشعار کا ذکر کیا ہے اگر وہ بھیج دینگے تو لطف اندوز ہونگا اور غالب
کی طبع جدید میں انھیں آپ کے حوالے سے درج کر دونگا۔
امید ہے آپ بہ خیر ہونگے اور کوئی خدمت میرے لائق ہو تو بے تکلف
تحریر فرمائیں، امتثال امر میں حتی الامکان کوتاہی نہ ہوگی انشاءاللہ تعالےٰ
والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ۔

نیاز مند۔ مہر

جب مجھے کتاب غالب موصول ہوئی اور میں نے کھول کر پڑھی تو
اس میں میری تقریر کا حوالہ موجود تھا۔
ایک اور خط یہ ہے

مسلم ٹاؤن لاہور ۳ مئی ۱۹۵۱ء باسمہ سبحانہٗ

کرمی۔ میں آپ سے شرمندہ ہوں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ کتابیں
بھیج رہے ہیں میں اس انتظار میں رہا کہ آجائیں تو جواب عرض
کروں۔ انکے آنے میں کم و بیش ڈیڑھ ماہ کا توقف ہوگیا یقیناً اس کے

ذمہ دار آپ نہ ہونگے لیکن انتظامات کی نوعیت ایسی کہ دیکھ بھال میں تاخیر ناگزیر ہو جاتی ہے پھر میں کراچی چلا گیا جہاں سے پرسوں واپس آیا۔ اس تاخیر کے لئے جو سراسر غیرارادی تھی تہ دل سے عفو خواہ ہوں امید ہے آپ مع خیر ہونگے والسلام علیکم و رحمتہ اللہ برکاتہ

نیازمند مہر

(۳۳) مولانا شیخ اکرام۔ آئی سی ایس میں کامیاب ہو کر بھارت کے مختلف اضلاع میں کلکٹری کے عہدے پر فائز رہے بعض آئی سی ایس انگریزی تصنیف و تالیف کا بھی مشغلہ رکھتے تھے اُن کی مانند شیخ صاحب نے علمی و ادبی سرگرمیاں شروع کیں "غالب نامہ" اور "آثار غالب" آپ کی منجملہ اور تصانیف کے بہت مشہور ہیں آپ کا برسوں پہلے ایک نوازش نامہ موصول ہوا تھا جس کی نقل درج ذیل ہے اس سے آپ کے شوق تحقیق اور غالب کے عمیق مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

محترمی

سلام مسنون۔ آپ کی تالیفات "انتخاب غالب" اور "کلیات اقبال" دیکھ کر آپ کو بلا سابقہ تعارف کے خط لکھنے کی جرات کر رہا ہوں

میں نے بھی اردو میں تین چار کتابیں لکھی ہیں۔ غالب نامہ جس کا تیسرا ایڈیشن حال میں شائع ہوا ہے۔ اور ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور علمی تاریخ (موسومہ چشمہ کوثر، رود کوثر، موج کوثر)

انتخاب غالب شائع کرکے آپ نے غالب کے متعلق ایک دو نئے مسائل پیدا کر دئے۔ قرائن سے تو خیال ہوتا ہے کہ سب تحریریں

غالب کی ہیں۔ لیکن کیا اس کی کوئی خارجی شہادت بھی ہے؟
ڈاکٹر ضیاء الدین کے پاس یہ مجموعہ کیسے پہنچا؟
آپ کو شاید یہ تو معلوم ہوگا۔ مجموعہ کی ابتدائی عبارت مندرجہ ۹-۱۰
ادبی دنیا میں کوئی دس سال ہوئے چھپی تھی۔ کیا ادبی دنیا والوں کو
یہ عبارت سید سجاد سے ملی تھی؟ اگر جواب نفی میں ہے۔ (اور میرا
قیاس ہے۔ اگرچہ ادبی دنیا اگست ۱۹۳۲ء کی مکمل کٹنگ میرے
سامنے تھی۔ کہ غالباً ادبی دنیا کا ذریعہ حصول کوئی اور ہوگا۔ کیونکہ
جہانتک مجھے یاد پڑتا ہے۔ ادبی دنیا میں ابتدائی عبارت کے
الفاظ کٹے پھٹے نہ تھے)۔ تو پھر اس مسودہ کے متعلق مزید تحقیق ہوسکتی ہے۔
میرا ارادہ جولائی کے آخر میں چند دن کے لئے حیدرآباد آنے کا
ہے۔ مقصد صرف اہل علم کی ملاقات اور بعض کتب خانوں اور
کتب فروشوں کی دوکانوں کی چھان بین ہے۔ میں اپنے جائے مقام کا
فیصلہ کرکے، آپ کی خدمت میں پھر لکھونگا۔ اگر آپ کے پاس وقت
ہوا۔ تو آپ سے ملنے کی کوشش کرونگا۔ لیکن اگر اس اثنا میں آپ
انتخاب غالب کی نسبت کوئی مزید واقفیت بہم پہنچا سکیں، تو
مشکور ہونگا۔ بالخصوص مجھے نقل مندرجہ صفحات (۴۱-۴۲) کی صحت
کی تلاش ہے۔ اس میں یادگار سے بعض جزوی باتیں مستزاد ہیں
اور اگر یہ نقل مستند ذرائع سے ملی ہو۔ تو میں اسے غالب نامہ کی
اگلی اشاعت میں درج کرنا چاہتا ہوں۔
تکلیف دہی کے لئے معافی چاہتا ہوں۔
نیازمند۔ محمد اکرام

(۴) منشی جیش پرشاد بے کنٹھ ہاشمی پروفیسر ہندو یونیورسٹی بنارس آپکی طلب پر میں نے مرزا غالب کے دو غیر مطبوعہ خط بھیجے تھے اس وقت تک مرتبہ کتاب خطوط غالب کی پہلی جلد شائع ہو چکی تھی میرے مرسلہ خط دوسری جلد کے لئے اشعار کیے تھے مگر دوسری جلد نہیں چھپی آپ کے ورثاء سے حاصل کر کے منشی مالک رام صاحب ترتیب دے کر شائع کر دیں تو کیسا اچھا ہو۔

(۵) منشی مالک رام صاحب محکمہ خارجہ ہند میں ملازم ہیں نہایت بلند پایہ ادیب ہیں آپ کے تذکرہ کے بغیر اردو ادب کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ آپ نے اپنے لئے "ذکر غالب" "تلامذہ غالب" "دیوان غالب" وغیرہ شائع کر کے علمی دنیا میں خاص مقام پیدا کر لیا ہے: بڑی حیرت ہے کہ جہانیاں جہاں گشت ہونے کے باوجود ان کو مواد کتب کے لیے کس طرح فراہم کیا کبھی مصر میں ہیں کبھی پیرس کبھی کہیں اور چاہیئے تو یہ تھا کہ فراق گورکھپوری کے مانند بھارت کی کسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہوتے تاکہ محققانہ تصانیف کے واسطے سہولت سے مواد حاصل کر سکتے۔ بیرون ہند آسانیاں کہاں سے میسر آئیں! آپ نے پچیس تیس سال پہلے ایک کرم نامہ میرے نام ارسال کیا تھا مگر میری غفلت اور سرکاری مصروفیتوں کے باعث وہ کرم نامہ کاغذات میں خلط ملط ہو گیا اور تلاش بسیار کے بعد بھی نہیں ملا اس سبب سے میں جواب نہیں دے سکا جس کا مجھ کو اب تک افسوس ہے: "میں نے ۱۹۳۶ء میں حیدر آباد ریڈیو سے جو تقریر نشر کی تھی اس میں ایک تو غالب کی مہر کا ذکر کیا تھا اور دوسرے

غالب کی طبی معلومات کی طرف اشارہ کیا تھا۔ یہ دونو باتیں میں نے کتاب "ذخیرۂ دولت شاہی" سے اخذ کی تھیں اس کتاب میں غالب کی قلمی تحریرات تھیں۔ ڈاکٹر سید قاسم معالج سمیات حیدرآباد کے کتب خانے سے یہ کتاب برآمد ہوئی تھی معلوم نہیں شاہان بیجاپور کا کتب خانہ جو نوادرات سے مملو تھا ڈاکٹر سید قاسم کے کس طرح ہاتھ لگا وہ سب کتابیں حیدرآباد لے آئے مگر کتابوں کی قدر و قیمت سے واقف نہیں تھے ستم ظریفی یہ کی کہ بعض کتابوں میں سرورق پر جو شاہی نام یا دستخط تھے اُن کو مٹا دیا تھا۔ "ذخیرۂ دولت شاہی" کے سرورق کے ذیل میں نقش ملاحظہ ہو۔

مہر اسداللہ خاں غالب دہلوی

رضینا قسمت الجبار فینا لنا علم وللجہال مال

اسداللہ خاں غالب

ذخیرہ دولت شاہی

بتاریخ ۲ رمضان المبارک داخل کتب خانۂ مبارک

گزرانیدہ جاں نثار ۲ جمادی الاول ۱۲۳۲ھ

بندہ دعاگوی جمع کنندہ ایں کتاب اسمٰعیل بن الحسن بن محمد بن احمد الحسینی الجرجانیا ایں ولایت بدید و حاجتمندی اہل ابن ولایت بعلم طب بشناخت ایں کتاب را بر سبیل خدمت ایں بادشاہ بساخت۔

ڈاکٹر مختار الدین آرزو نے رسالہ آجکل بابتہ فروری ١٩٥٦ء میں غالب کی مہر کے متعلق مشکوک ظاہر کئے تھے دلیلیں بھی پیش کی تھیں اور آخر میں لکھ دیا تھا کہ "بلا شبہ یہ مہر مرزا غالب کی مہر نہیں ہو سکتی" اس پر ادارہ آجکل کی جانب سے ایک فٹ نوٹ شائع ہوا ہے جس کا اقتباس یہ ہے:۔

مالک رام صاحب کے مضمون مطبوعہ ادبی دنیا بابتہ ماہ اپریل ١٩٤١ء سے ذیل کا اقتباس فاضل مضمون نگار (ڈاکٹر مختار الدین آرزو) کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے کافی ہے۔

اس مہر کا ذکر سب سے پہلے جناب محمد عبد الرزاق صاحب راشد مددگار معتمد فینانس ریاست حیدرآباد دکن نے اپنی ایک ریڈیو تقریر میں کیا تھا جو وہاں کے روزنامہ صحیفہ کی اشاعت ٢٠ فروری ١٩٣٦ء میں شائع ہوئی اس تقریر میں جناب راشد صاحب نے کہا تھا کہ ڈاکٹر سید قاسم صاحب (پتھر گٹی حیدرآباد) کے کتب خانے میں علم طب کی ایک کتاب "ذخیرہ دولت شاہی" ہے جس پر مرزا غالب کی مندرجہ صدر مہر ہے اور کتاب کے صفحات پر حاشیہ میں غالب کی تحریریں بھی ہیں..... پچھلے دنوں ایک کام سے مجھے حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا اس کتاب کو

دیکھنے کے لئے میں ڈاکٹر سید قاسم صاحب کے دولت خانہ پر حاضر ہوا انہوں نے بہت مہربانی فرمائی کہ کتاب مشارالیہ مجھے دیکھنے کو دی میں نے سرورق پر مہر دیکھی واقعی مرزا غالب کی مہر ہے مربع شکل ہے اردگرد یہ شعر کندہ ہے

رضینا قسمت الجبار فینا لنا علم وللجہال مال

اور عین وسط میں لکھا ہے اسد اللہ خاں غالب ۱۲۴۸ھ مہر کی پیشانی پر خط نستعلیق میں ہاتھ سے یہ شعر لکھا ہے اور نیچے

اسد اللہ خاں دہلوی ....

میں نے "ذخیرہ دولت شاہی" کے حوالے سے غالب کے علمی معلومات کا تذکرہ کیا تھا اس کو آفاق صاحب نے اپنی کتاب "نادرات غالب" میں پھیلا کر لکھا ہے۔

ڈاکٹر سید قاسم کا قیمتی کتب خانہ ان کی زندگی ہی میں حکومت حیدرآباد نے خرید لیا اور اس کو تین جگہ بانٹ دیا۔ ½ حصہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ¼ محکمہ آثار قدیمہ میں اور ¼ حصہ شفاخانہ عثمانیہ موقوعہ چار مینار کی لائبریری میں منتقل ہوا ہے کتاب "ذخیرہ دولت شاہی" یہاں موجود ہے۔

ذکر غالب کے صفحہ (۱۰۶) پر مالک رام صاحب نے لکھا ہے کہ "یہ کتاب محمد عبدالرزاق صاحب نے مرتب کی اور دین محمدی پریس لاہور سے چھپ کر ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی اس کا سارا مضمون کم و بیش پہلے سے موجود ہے"۔ موصوف اس صفحہ کے فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں کہ مطبوعہ

دیکھنے کے لئے میں ڈاکٹر سید قاسم صاحب کے دولت خانہ پر حاضر ہوا انہوں نے بہت مہربانی فرمائی کہ کتاب مشارالیہ مجھے دیکھنے کو دی میں نے سرورق پر مہر دیکھی واقعی مرزا غالب کی مہر ہے مربع شکل ہے اور گرد یہ شعر کندہ ہے

رضینا قسمۃ الجبار فینا لنا علم و للجہال مال

اور عین وسط میں لکھا ہے اسد اللہ خاں غالب ۱۲۳۸ مہر کی پیشانی پر خط نستعلیق میں ہاتھ سے یہ شعر لکھا ہے اور نیچے

اسد اللہ خاں دہلوی ....

میں نے "ذخیرہ دولت شاہی" کے حوالے سے غالب کے علمی معلومات کا تذکرہ کیا تھا اس کو آفاق صاحب نے اپنی کتاب "نادرات غالب" میں پھیلا کر لکھا ہے۔

ڈاکٹر سید قاسم کا قیمتی کتب خانہ ان کی زندگی ہی میں حکومت حیدر آباد نے خرید لیا اور اس کو تین جگہ بانٹ دیا۔ ⅓ حصہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ⅓ محکمہ آثار قدیمہ میں اور ⅓ حصہ شفا خانہ عثمانیہ موقوعہ چار مینار کی لائبریری میں منتقل ہوا ہے کتاب "ذخیرہ دولت شاہی" یہاں موجود ہے۔

ذکر غالب کے صفحہ (۱۰۶) پر مالک رام صاحب نے لکھا ہے کہ "یہ کتاب محمد عبدالرزاق صاحب نے مرتب کی اور دین محمدی پریس لاہور سے چھپ کر ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی اس کا سارا مضمون کم و بیش پہلے سے موجود ہے"۔ موصوف اس صفحہ کے فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں کہ مطبوعہ

کتاب ڈاکٹر ضیاء الدین دہلوی کے کتب خانہ کے قلمی نسخے کی نقل ہے اس کا ایک اور قلمی نسخہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد) کے پاس ہے اس کا ذکر "رقعات غالب" کے نام سے خطوط غالب کے دیباچے میں آیا ہے اور اس کا دیباچہ اور خاتمہ علی گڈھ میگزین غالب نمبر میں بھی چھپ چکے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ میری مطبوعہ کتاب ڈاکٹر ضیاء الدین دہلوی کے قلمی نسخے پر نہیں بلکہ اصل نسخے پر مبنی ہے یہ اصل نسخہ سید سجاد صاحب استاد عثمانیہ یونیورسٹی نے مجھے عنایت کیا تھا۔ دوسرا امر ضروری التحریر یہ ہے رقعات غالب کا نام بدل کر میں نے انتخاب غالب کے نام سے یہ کتاب سے پہلے ۱۹۳۵ء میں شائع کی تھی جو مالک رام صاحب کی نظر سے نہیں گزری ورنہ وہ یہ نہ لکھتے کہ اس کا سارا مضمون کم و بیش پہلے سے موجود ہے۔ ۱۹۴۳ء میں صاحب شاہ محمد صاحب ایڈیٹر رسالہ پیغام لاہور حیدر آباد آئے تھے مجھ سے ملاقات کے واسطے تشریف لائے بات چیت کے بعد جب وہ مجھ سے رخصت ہونے لگے تو میں نے انہیں مطالعہ کے لئے چند رسالے اور کتابچے تحفتہً دئے تھے جن میں میری مطبوعہ کتاب "انتخاب غالب" بھی شامل تھی۔ لاہور واپس جانے کے بعد شاہ صاحب نے مجھ سے استمزاج کئے بغیر یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں چھپوا کر شائع کردی اسی کے ایک نسخے کا مالک رام صاحب حوالہ دیتے ہیں۔ مزید تحقیق کے لئے میں نے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب سے استفسار کیا تھا ممدوح نے یہ جواب مرحمت فرمایا۔

۲۲ (الف) میور روڈ الہ آباد ـــ ۱   ۹ ر ستمبر ۱۹۲۱ء

مخدوم و مکرم تسلیم

۴ ر ستمبر کے الطاف نامے نے ممنون کیا کتابچہ جو آپ نے بھیجا کل مل گیا تھا اس کا ایک نسخہ رسالہ تحفہ کے ذیل میں چھپا تھا میرے پاس پہلے سے محفوظ ہے میں جہاں تک جانتا ہوں تحفہ بابتہ شوال ذیقعدہ ۱۳۲۲ء سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوا تھا۔

عزیزی محمد عبدالستار کو دعا

نیاز مند عبدالستار صدیقی

علامہ طباطبائی کی شخصیت ایسی پرکشش تھی کہ حیدر آباد اور سکندر آباد کے شہروں میں جب مشاعروں کی صدارت فرماتے تھے تو لوگ کثرت سے جمع ہوتے اور مجالس شعر میں گرمی پیدا ہو جاتی تھی اور علامہ کی میدان ادب پر گرم روی دیکھ کر لوگ تحسین و آفرین کے نعرے بلند کرتے تھے علامہ کے پڑھانے کا طرز ایسا عجیب و غریب تھا کہ جس کو جس موضوع پر جو کچھ پڑھاتے اس موضوع سے پڑھنے والے کے دل میں گہری دلچسپی پیدا ہو جاتی۔ مجھ میں غالب کے ساتھ ایسا شوق و شغف پیدا کیا کہ ۱۹۱۰ء سے آجتک غالب کے خطوط و اشعار یا تحریرات غیر مطبوعہ کی تلاش کرتا رہتا ہوں آندھرا پردیش اسٹیٹ کے ریکارڈ آفس سے مراسلت کر رہا ہوں کہ غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں کی متعلقہ مسلیں برآمد کی جائیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ حیدر آباد میں کب آئے کس محلہ میں سکونت اختیار کی کتنی مدت تک نوکری کی مشاہرہ کیا پاتے تھے اور یہاں کی ملازمت ترک کر کے چلے جانے کے کیا اسباب تھے میرا قیاس یہ ہے کہ نظام علی خاں کے بیٹے عالی جاہ نے جب

بغاوت کی تو کسی ایک طرف سے انہیں لڑائی میں حصہ لینے کہا گیا ہوگا
لیکن میرزا دولہا نے باپ بیٹے کی جنگ میں لڑنے کو مناسب نہ جانا ہوگا۔
ہنوز ریکارڈ آفس سے اس بارے میں کوئی سراغ نہیں ملا۔

مجھکو جو غیر مطبوعہ کلام دستیاب ہوا تھا اس کو میں نے بعض رسائل
میں شائع کرا دیا۔ ایک غیر مطبوعہ غزل کے دو شعر ظفر الملک کو دست بدست
ملے تھے جب کہ وہ حیدر آباد آئے تھے دو دو شعر رسالہ الناظر لکھنؤ میں اور پوری
غزل رسالہ ماہ نو کراچی میں چھپی تھی اس غزل کے بعض مصرعے نہیں تھے ایک
صاحب نے تکمیل غزل کے لئے مصرعے رسالہ ماہ نو بابتہ ۱۹۶۳ء میں چھپوائے
مگر یہ ایسے مہمل ہیں کہ کوئی صاحب ذوق تسلیم نہیں کر سکتا کہ غالب کے
کہے ہوئے ہیں۔

(۶) نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔ فن شعر و سخن کے مستند مسلم الثبوت
استاد یگانہ روزگار ہیں۔ لکھنؤ کی ذی کمال ہستیوں کی آخری یادگار
ہیں آپ کا کلام اردو ادب کا گنج شائگاں ہے آپ نے غالب کا
گہرا مطالعہ کیا ہے اور "مطالعہ غالب" کے نام سے ایک کتاب تصنیف
کی ہے جو قابل دید ہے برسوں پہلے آپ نے ازراہ تلطف اپنا پہلا
دیوان "اثرستان" مرحمت فرمایا تھا اور یہ نوازشنامہ بھیجا تھا۔

اناو ۳۱ جولائی ۱۹۲۶ء

مکرمی تسلیم

آپ کا خط مخلوط ہوگیا تھا اس وجہ سے اثرستان کی روانگی
میں تاخیر ہوی پھر یہ ترکیب سوجھی کہ رسالہ تاج کے ایڈیٹر صاحب کی
معرفت دیوان آپ کو روانہ کردوں براہ کرم مطلع فرمائیے کہ ملا یا نہیں

اگر نہ پہنچا ہو تو دوبارہ روانہ کروں۔

آج اتفاق سے آپ کا خط مل گیا پتہ بھول گیا تھا اسے دیکھکر یہ عریضہ تحریر کیا۔

خاکسار اثر

(۷) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔ آپ عثمانیہ یونیورسٹی آرٹس اینڈ سائنس کالج کے پہلے پرنسپل تھے۔ حیدرآباد کے سرکاری حلقے سازشوں کے لئے مشہور ہیں آپ اپنی راست بازی اور حق پرستی کے باعث ان سازشوں اور جوڑ توڑ کی تاب نہ لاسکے اور ہندوستان کی دوسری یونیورسٹی میں منتقل ہو گئے میرے بھائی عبدالستار آپ کے زمانے میں بی۔اے کلاس میں زیر تعلیم تھے وہ کہا کرتے تھے کہ دیوان غالب کے اشعار کی باریکیوں اور دقیق مطالب کو اس قدر آسان بنا دیتے تھے کہ طلبہ کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی تھی میرے بھائی آپ کے علم و فضل کے ثناخواں تھے اور آپ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے مجھ سے ہمیشہ آپ کے حسن سلوک اور اخلاق عالیہ کا ذکر کرتے تھے آپ کی کوئی مستقل تصنیف غالب پر نہیں ہے لیکن غالب سے متعلق آپ کے تحقیقانہ مضامین رسالہ ہندوستانی الہ آباد میں نکلتے تھے آپ کی غالب شناسی مشہور ہے۔

(۸) ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم۔ میں نے آپ کو علی گڈھ کالج میں سرسید ڈے کے موقعہ پر دیکھا تھا۔ متوسط القد چھریرا بدن سر پر دوپلی ٹوپی اور اچکن پہنے ہوئے تھے یہ ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے۔ کچھ عرصہ پہلے انگلستان میں فارغ التحصیل ہو کر اور علمی ڈگریاں لیکر

وطن کو مراجعت کی تھی مغربی و مشرقی علوم و فنون کے جامع تھے
"محاسن کلام غالب" آپ کی معرکتہ الآراء تصنیف ہے یہ ابتدا
میں رسالہ اردو اورنگ آباد میں بشکل مضمون چھپی تھی پھر دیوان غالب
نسخہ حمیدیہ کے مقدمے کے طور پر شائع ہوئی علیحدہ کتابی شکل میں
بھی کئی دفعہ چھپی اس پر مولانا سید سلیمان ندوی نے رسالہ معارف
میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے افراتفری سے کام
لیا ہے یعنی مبالغہ کیا ہے۔ لیکن ایسے زمانے میں جبکہ مغرب سے
اہل ہند مرعوب ہیں اور احساس کمتری رکھتے ہیں کچھ ہمت دلانے
کے واسطے ایسا مبالغہ ضروری تھا بجنوری مرحوم نے ایک طرف اس
سوال کا جواب دیا ہے کہ اردو شاعری میں گل و بلبل اور شمع و
پروانہ کے سوا کیا رکھا ہے اور دوسری جانب غالب کی قوت فکر
کا تقابل مغربی ملکوں کے مشہور شعرا سے کیا ہے اور ثابت کیا ہے
کہ مشرقی دماغ مغربی دماغ سے کمتر نہیں ہے غالب کے بارے میں
مولانا حالی کی کتاب یادگار غالب نقش اول کی حیثیت رکھتی ہے
تو "محاسن کلام غالب" نقش ثانی کی۔ موخرالذکر میں ڈاکٹر بجنوری
نے وہ زور قلم دکھایا ہے اور حقائق و معارف کے دریا بہائے ہیں
کہ اردو ادب کے لئے سرمایۂ ناز ش ہے۔ افسوس صد افسوس
کہ ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۱۸ء کے انفلوئنزا میں عین عالم شباب میں اپنی
جان جان آفریں کو سپرد کر دی۔ علمی طبقے آپ کی جوانمرگی پر آج تک
سوگوار ہیں اور ابد تک رہیں گے کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی سی ہستیاں
صدیوں میں ملکر کہیں پیدا ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے حالات زندگی

بھی معرض تحریر میں نہیں آئے عفی انوارالحق مرتب نسخہ حمیدیہ نے نہ صرف بجنوری مرحوم کا بلکہ اس کا بھی ماتم کیا ہے کہ مرحوم کے رشتہ داروں اور دوستوں میں سے کسی نے حالات و واقعات لکھنے یا بھیجنے کی جانب اعتنا نہ کی۔ کاش کوئی اہل قلم اب بھی حالات تحریر کرنے کی زحمت گوارا کرے۔

(۹) ڈاکٹر سید محی الدین زور مرحوم۔ دکن میں ایک عرصہ کے جمود کے بعد خدا نے ایک نادر ہستی پیدا کی جو ڈاکٹر زور کے قالب میں نمودار ہوئی جس نے طالبعلمی کے زمانے میں روح تنقید نامی کتاب لکھ کر خراج تحسین حاصل کیا۔ لوگوں کی معاندانہ تنقید کے باوجود روح تنقید اردو ادب میں اپنا مقام رکھتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے دکنی ادب کے جسم میں تازہ روح پھونکی اور اپنی تصنیفات و تالیفات سے قطب شاہی دور کے ادب سے ملک کو روشناس کیا ایوان اردو کی تعمیر زور کا زبردست اور غیر فانی کارنامہ ہے یہاں دور دور سے اہل قلم آکر نوادرات سے استفادہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی متبادلہ تصانیف سے ایک "سرگزشت غالب" نامی کتاب غالبیات میں اضافہ کا باعث ہوئی ہے۔ ڈاکٹر زور کلام غالب پر سر دھنتے تھے اپنی مرگ ناگہانی سے جو کشمیر میں واقع ہوئی ادبی حلقوں کو آج تک ماتم میں رکھا ہے ڈاکٹر بجنوری کی مانند زور کی رحلت کا داغ لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ رہیگا۔ زور مرحوم کے بعد ادارہ ادبیات سو رہا ہے۔ مرحوم کے زمانے میں ایوان اردو کی چہل پہل قابل دید تھی کیسے کیسے اکابر ملک و ملت اور رؤسا وزرا، حکما، ادبا، شعرا ایوان اردو میں آکر اس کی رونق کا باعث بنتے

تھے۔ زور کی زورِ دماغ آپ چلتا ہوا جادو تھا۔ جو اہلِ ذوق کو مسرور کر رکھتا تھا اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر زور کا کوئی نعم البدل عطا کرے۔

(۱۰) نادم سیتا پوری۔ مولوی اکرام علی اور فورٹ ولیم آپ کی مشہور تصنیف ہے جس میں آپ نے دادِ تحقیق دی ہے اس کتاب پر حکومت ہند نے ازراہِ قدردانی آپ کو انعام عطا کیا ہے۔ غالب کے متعلق آپ نے بہت سے بیش بہا مضامین لکھے ہیں "غالب نام آورم" نامی کتاب بہت مقبول ہوئی ہے "الحاق کلام غالب" بھی شائع کی ہے جو میری نظر سے نہیں گزری آپ کی غالب سے متعلق تصنیفات نے غالبیات میں گراں بہا اضافہ کیا ہے بیسیوں اخبارات و رسائل کی آپ نے ادارت کی ہے اور اپنے رشحاتِ قلم سے اہلِ ذوق کو سیراب کرتے رہتے ہیں اَللّٰھُمَّ زِد فَزِد۔

(۱۱) قاضی عبدالودود بیرسٹر پٹنہ۔ چار برس پہلے آپ حیدرآباد آئے تھے تو مجھے شرفِ نیاز حاصل ہوا تھا۔ ڈاکٹر اقبال بھی بیرسٹر تھے ان سے آپ اس بارے میں مشابہت رکھتے ہیں کہ قانون کا پیشہ انہیں بھی پسند نہیں تھا۔ دونوں نے ادبیات کو عروج پر پہنچایا۔ قاضی صاحب نے غالب پر جو تحقیق کی ہے اس کے نتائج علی گڑھ میگزین میں شائع ہو چکے ہیں آپ کا ایک عنایت نامہ درج ذیل ہے۔

۱۱ اپریل ۱۹۶۲ء پٹنہ ۴ (یہ پتا کافی ہے)

مشفق کرم۔ میں پرسوں سفر سے واپس آیا تو آپ کا خط ملا اور یہ معلوم ہوا کہ کتابیں آپ تک پہنچ گئی ہیں میں غالب کی تصانیف (فارسی و اردو) کے ناقدانہ نسخے شائع کرنا چاہتا ہوں فی الحال

بھی معرض تحریر میں نہیں آئے مفتی انوار الحق مرتب نسخہ حمیدیہ نے نہ صرف بجنوری مرحوم کا بلکہ اس کا بھی ماتم کیا ہے کہ مرحوم کے رشتہ داروں اور دوستوں میں سے کسی نے حالات و واقعات لکھنے یا بھیجنے کی جانب اعتنا نہ کی۔ کاش کوئی اہل قلم اب بھی حالات تحریر کرنے کی زحمت گوارا کرے۔

(۹) ڈاکٹر سید محی الدین زور مرحوم۔ دکن میں ایک عرصہ کے جمود کے بعد خدا نے ایک نادر ہستی پیدا کی جو ڈاکٹر زور کے قالب میں نمودار ہوئی جس نے طالبعلمی کے زمانے میں روح تنقید نامی کتاب لکھ کر خراج تحسین حاصل کیا۔ لوگوں کی معاندانہ تنقید کے باوجود روح تنقید اردو ادب میں اپنا مقام رکھتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے دکنی ادب کے جسم میں تازہ روح پھونکی اور اپنی تصنیفات و تالیفات سے قطب شاہی دور کے ادب نے ملک کو روشناس کیا ایوان اردو کی تعمیر زور کا زبردست اور غیر فانی کارنامہ ہے یہاں دور دور سے اہل قلم آکر نوادرات سے استفادہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی متعدد تصانیف سے ایک "سرگزشت غالب" نامی کتاب غالبیات میں اضافہ کا باعث ہوئی ہے۔ ڈاکٹر زور کلام غالب پر سر دھنتے تھے اپنی مرگ ناگہانی سے جو کشمیر میں واقع ہوئی ادبی حلقوں کو آج تک ماتم میں رکھا ہے ڈاکٹر بجنوری کی مانند زور کی رحلت کا داغ لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ رہیگا زور مرحوم کے بعد ادارہ ادبیات سو رہا ہے۔ مرحوم کے زمانے میں ایوان اردو کی چہل پہل قابل دید تھی کیسے کیسے اکابر ملک و ملت اور رؤسا وزرا، حکما، ادبا، شعرا ایوان اردو میں آکر اس کی رونق کا باعث بنتے

(۲۵) ہمارے باب میں ہوئی ہے گفتگو کیا کیا (۲۶) شیخ بقاء اللہ بقا (۲۷) مہتاب الدولہ درخشاں (۲۸) مالک الدولہ صولت (۲۹) مہاتما گاندھی و ترک موالات ناتمام غیر مطبوعہ (۳۰) تاریخ دکن مرتبہ خلیل و اختر میں ترمیمات اور ضروری مضامین کا اضافہ۔

(۳۱) ہوا خواہان اردو سے التماس۔ یہ مضمون مولوی وحیدالدین سلیم کی کتاب اصطلاحات تصنیف کا محرک ہوا ہے۔

(۳۲) وحدت وجود۔ اس مضمون کو پڑھ کر لسان العصر اکبر الہ آبادی نے علامہ کو لکھا کہ "میں بجز اس کے کیا کہوں روحی لک الفدا۔ آپ کبھی لکھنو آتے ہی نہیں کہ ذرا ملاقات ہو" نثار یار جنگ مزاج الہ آباد جا کر اکبر سے ملتے تھے جب وہاں سے چلنے لگے تو اکبر نے ان سے کہا کہ میری طرف سے علی حیدر کو سلام کہنا مزاج نے کہا مجھ سے ملاقات نہیں ہے تو پھر کہا کہ جب کبھی ہو جائے۔ اکبر نے اپنا دیوان بطور تحفہ علامہ کی خدمت میں بھیجا تھا اور ہمیشہ ملاقات کا اشتیاق ظاہر کرتے تھے۔

(۳۳) ٹمیا برج کے سبع سیارے۔ نواب واجد علی شاہ کے دربار کے شاعروں اور مشاعروں کا حال لکھنے کی ہر سمت سے خواہش کی جاتی تھی اس لئے علامہ نے شعرائے ذیل کے جو سبع سیارے کہلاتے تھے حالات و واقعات قلمبند کئے اور ایک لکچر کی صورت میں عثمانیہ یونیورسٹی میں سنائے۔

(۱) مالک الدولہ صولت (۲) مہتاب الدولہ درخشاں (۳) فتح الدولہ برق (۴) مرزا مسیتا عیش (۵) آغا محمد شرف (۶) مرزا امداد علی یادو (۷) مظفر علی اسیر (۸) مرزا علی بہار بہار (۹) شیخ صادق علی ماہر (۱۰) مرزا جہاں قدر فیض (۱۱) مرزا آسمان جاہ انجم (۱۲) ولی عہد اودھ

حامد علی مرزا کوکب (۱۳) نواب واجد علی شاہ اختر۔ علامہ کا یہ
مضمون عثمانیہ یونیورسٹی کے مجلہ عثمانیہ جلد ششم شمارہ اول ۱۹۳۲ء
میں طبع ہوا اور اسی سے کتاب "نواب واجد علی شاہ اور ان کا عہد"
میں نقل کیا گیا۔ مٹیا برج کے جو حالات و واقعات علامہ لکھ گئے
ہیں وہ بسا غنیمت اور اردو ادب کی تاریخ کا ایک ریشن باب ہے۔
میں نے شمالی ہند کے بعض ادیبوں کو خطوط لکھے تھے کہ انہیں نواب
واجد علی شاہ کے درباری شعرا کے حالات ان کے علاوہ جو علامہ نے لکھے
ہیں معلوم ہوں تو قلمبند کر دیں لیکن صدائے برنخاست کسی نے ہامی نہیں
بھری بعض میرے تقاضوں سے ناراض ہو گئے۔ مولانا حافظ فضل حق
آزاد سے جو استاد فن شعر تھے اور جن سے معمولاً میری خط کتابت تھی
مجھے بڑی توقع تھی کہ مٹیا برج کے حالات تحریر کر دینگے لیکن کئی ہفتوں تک
میرے خطوط کا جواب بھی نہیں دیا میں سمجھا کہ مولانا نے میری فرمائش کو
تکلیف مالایطاق جانکر خاموشی اختیار کر لی ہے ایک خط میں میں نے
موصوف سے پوچھا کہ کیا مجھ سے ملال ہو گیا ہے اس کے جواب میں ذیل کا
مکرمت نامہ ارسال کیا اور اصل موضوع حالات مٹیا برج پر ایک حرف بھی
نہیں لکھا۔

"از سلطان گنج پٹنہ بانکی پور

سخنور نقاد سخن سر آمد شیریں سخنان دکن سلامت

آپ نے مجھ سے پوچھا کہ کہ آپ سے مجھ کو کچھ ملال تو نہیں ہو گیا ہے
میں اس سوال سے ناخوش نہیں گر ہے یہ سوچ

کس احتمال قوی پر یہ ہے سوال ملال

سوال رسم محبت سمجھ کے میں چپ ہوں
وگرنہ کفر محبت ہے احتمال ملال

میں وہ نہیں کہ کسی سے ہوں بے سبب ناخوش
نہیں وہ میں کہ ہوں بے وجہ پائمال ملال

کشیدہ کیا ہوں کسی سے زمانہ فرسودہ
شگفتہ طبع رہیں مورد وبال ملال

جو رَو بہائے لئے جا رہی ہے دنیا کو
خوشی کی اس میں بہا ہی کسے دھن کسے خیال ملال

وہ میری آنکھ میں آنسو نہیں رہے ورنہ
عوض خوشی کے بہاتا لہو بہ خیال ملال

نکالتے ہیں خوشی کے ملال میں پہلو
وہ دوست مدنظر جن کو ہے مآل ملال

انہیں کی ایک طرح یہاں کٹ گئی آزاد
خوشی کی جس کو خوشی کچھ نہ کچھ ملال ملال

زیادہ کیا لکھوں جب آپ کی یاد آتی ہے رباعی ذیل میں اپنے خیال کو تازہ کر لیتا ہوں۔

راقم

اے آنکہ ترا نہ دیدہ دریافتہ ام — از ہستی خود ز خود خبر یافتہ ام
دائم ہستم و لیک غائب ز نظر — غواص حقیقتم گہر یافتہ ام

اس کارڈ میں اتنی گنجائش نہیں لفظ علامہ پر آئندہ رقیمہ میں روشنی

ڈالونگا کچھ دن بعد واپس چلا جاؤنگا۔

زندہ اپنی سستی سے شرمندہ

احقر العباد علامہ آزاد

مکرمی مولانا عبدالرزاق صاحب راشد

ظفر جنگ کا باغ حیدر آباد دکن۔

اس کارڈ پر مولانا نے کوئی تاریخ نہیں لکھی ڈاک خانہ کی مہر پر ۲۳ جون ۱۹۳۵ء درج ہے۔

۳۴ ادب الکاتب والشاعر بہت مبسوط مقالہ ہے جو فن ادب و انشا کے اسرار پر مشتمل ہے بعض میں بالاقساط چھپا اور اس قدر مقبول ہوا کہ ایک رسالہ دوسرے سے نقل کرتا تھا۔ اس کو لوگ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔

۳۵ مراثی میرانیس کے تین حصوں کو صحیح کر کے مقدمے کے ساتھ علامہ نے دارالترجمہ میں پیش کردیا تھا مطبع نظامی بدایوں میں یہ مراثی چھپے تھے تصحیح شدہ مراثی مطبع نظامی نے دارالترجمہ کو واپس کردیے مگر ان کا پتہ نہیں چل رہا ہے۔

علامہ نے امرؤالقیس کی شرح بڑی دیدہ ریزی اور محنت و مشقت سے لکھی ہے اور ابتدا میں یہ وضاحت کی ہے

...... شرح کرنے میں اصطلاحات کو اس کثرت سے لاتے ہیں کہ اردو زبان نہیں باقی رہتی اور اصل شعر کا لطف نہیں آتا۔

ان شعرا (یعنی عرب شعرا) کے بچے دل پر پڑے ہوئے ہیں آج تک

وہ نقش نہیں مٹے۔ ان اشعار سے فن معانی و بیان میں جان پڑگئی اور تفسیر و حدیث کی شان بڑھ گئی قرآن و حدیث کے الفاظ و محاورات کی سند انہیں اشعار سے لی جاتی ہے اور فن بلاغہ میں اسالیب کلام کی مثالیں انہیں شعرا کے کلام سے پیش کی جاتی ہیں ان سب میں امرؤالقیس گل سرسبد ہے فسق و فجور پر افتخار۔ شراب خواری پر غرور قمار بازی پر ناز ان امور کو سخاوت و کرم و امارت و شجاعت کا تمغا سمجھتے تھے۔ مدتوں عربی پڑھنے کے بعد ان کے بزم و رزم کے مناظر سمجھ میں آتے ہیں۔ اس دیوان (امرؤالقیس کی) سے ان شعرا کو مفید ہو گا جو شعرائے عرب کا جوش و جذبات اردو میں پیدا کرنا چاہیں۔ عربی اور اردو گتھی مل جائے وجہ یہ عبارت ہو گی مطلب یہی ترجمہ لفظی سے میں نے احتراز کیا ہے کہ مقصود شاعر فوت نہ ہونے پائے۔ حل لغات میں جہاں تک ممکن ہوا اصطلاحات نحوی و صرفی ترک کر دیئے ہیں کہ اصطلاحات اجنبی ہوا کرتے ہیں جس سے ناظرین کو وحشت ہوتی ہے۔

شرح امرؤالقیس سے ایک بیت کا مطلب پڑھئے۔

امرؤالقیس کا ایک مشہور قصہ

الارب یوم لک منہن صالح ولا سیما یوم بدارۃ جلجل

مطلب۔ تیرے کتنے ہی دن لطف کے ان نازنینوں کے ساتھ گذر چکے ہیں خصوصاً اس تالاب والے جلسے کا دن جس کا نام دارۃ الجلجل ہے (کیا عیش کا دن تھا)

قصہ۔ ایام عرب کی روایتوں میں یہ ذکر آیا ہے کہ شرحبیل کی بیٹی عنیزہ امرؤالقیس کی بنت عم تھی یہ اس پر فریفتہ تھا وہ اسے منہ نہ لگاتی تھی

ایک دن قبیلہ کی کچھ ہم سن اور کم سن عورتیں دارۃ الجلجل پر نہانے گئیں یہ سب سے پیشتر وہاں پہنچ گیا اور چھپ گیا۔ انہیں عورتوں میں عنیزہ بھی تھی سب کپڑے اتار اتار کر پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوئی تھیں مگر انہیں لیے نگاہ شوق ہر ایک کو وہم ہوتا تھا جیسے کسی نے چٹکی لے لی پھر دیکھیں تو کوئی بھی نہیں ؎

چھپ چھپ کے جو دیکھوں تو جھپ جاتی ہیں نظریں
اتنی بھی نہ ہو طاقت دیدار کسی کی

اس نے دور سے دیکھا کہ سب کی سب تالاب میں اتر گئیں اب یہ کمین گاہ سے نکل کر گھاٹ پر آیا سب کے کپڑوں کو دبا کر بیٹھ گیا قسم کھائی کہ جب تک برہنہ نکل کر سب کے میرے سامنے نہ آئیں گی اور اپنا حسن بے پردہ نہ دکھائیں گی میں کپڑے نہیں دینے کا۔ معلوم ہوتا تھا کنہیا جی نے تالاب کے کنارے جنم لیا ہے گر الٹوں کی جز بان دبائے بیٹھے ہیں گوالنوں کا شرمانا لجانا آنکھیں دکھانا ہاتھ جوڑنا پاؤں پڑنا کچھ اثر نہیں کرتا عورتوں کو پانی میں پہروں گذر گئے منت کے مقابلے میں حجت تکرار کے جواب میں اصرار ایک عرصہ تک ہوتا رہا۔ آخران سب میں جو بہت بے باک تھی تالاب سے نکل آئی اس نے سر سے پاؤں تک ایک ایک نظر دیکھ کر کپڑے اس کے دے دئے۔ پھر تو ایک سے ایک پری زاد اپنے حسن کا مرقع اپنے شباب کی تصویر دکھانے لگی ہر ایک اپنے ہی کپڑے انعام میں پانے لگی سب کے آخر میں عنیزہ منہ بنائے تیوری چڑھائے گردن جھکائے کوسے دیتی ہوئی نکلی ادھر یہ قطعہ زبان سے نکلا۔

دو کنول بھر گئے بلور کے روشن ہو کر   عالم نور دکھاتا ہے ترا جوش شباب

سینہ آئینہ تھا اس میں جو ابھرے حباب عکس مسی کا پڑا غنچۂ سوسن ہو کر

نازنین سا قد جیسے شاخِ یاسمین جس پر شباب کا یہ عالم کہ ہر طرف سے ابلا پڑتا ہے اس بیت میں تصویر کھچی ہوئی ہے۔

کن کن خمروں سے قدِ نازک کو سنبھالا کس بوجھ کو صدمۂ کمرِ یار نے کھینچا

پہلے سوالیہ چوکی طرح ٹھٹکی کھڑی رہی آخر نگاہِ شوق اپنا کام کر گئی چلی اور عجب انداز سے چلی۔

ہے اس کی ادا قاتلِ عالم دمِ رفتار تلوار لگا دی ہے نزاکت نے کمر میں

سر جھکائے ہوئی تھی لیکن

کبھی تیوری چڑھا کے دیکھ لیا اور کبھی مسکرا کے دیکھ لیا

مجھ پر احسان ہوا نزاکت کا تو نے گر آنکھ اٹھا کے دیکھ لیا

کنارِ آب سے آغوشِ مشتاق تک آنا ہر ہر قدم پر شرمانا ٹھہر ٹھہر کر قدم اٹھانا قیامت کر رہا تھا۔

چھٹتے ہیں گریباں جو چلنے پہ صبا کے شاید یہ اڑا لائی ہے رفتار کسی کی

اس غزل میں یہی مضمون مسلسل آگیا ہے۔

بکھری ہوئی وہ کاکلِ خمدار کسی کی چھپتی ہوئی وہ نرگسِ بیمار کسی کی

وہ جوشِ سخن لب سے نمایاں تہِ خوشی وہ موجِ تبسم دمِ گفتار کسی کی

یہ آنکھ جھپکی پڑتی ہے وہ آنکھ ہے مدہوش کس طرح خبر لے کوئی مے خوار کسی کی

ابرو کے اشارے سے نکلتا ہے یہ مطلب موت آئی ہے پڑ جائے گی تلوار کسی کی

حسرت سے جو دیکھوں تو کہیں تیر بھی نگاہیں ہو جائے گی سینہ سے سناں پار کسی کی

مشکو تو اس آفت کے ستم اس پہ یہ اصرار اور پھر نہ اٹھے آنکھ خبردار کسی کی

سو آنند دئے بوسہ کا خوں اس نے کیا ہے دیتی ہے خبر سرخیِ رخسار کسی کی

چو رنگ کے تیغ نگہ سے جگر و دل
اور لطف یہ ہے آنکھ نہیں چار کسی کی

آخر وہ راہ شب ہجر کی طرح کوتاہ ہو گئی خواہش دید اپنی مراد کو شیریں فرہاد کو پہنچی۔ عنبر نے کپڑے پہن کر پھر شکایت آغاز اور زبان ملامت دراز کی قلم بند گالیاں اور اس نے وہ چند کو سنے دئے انجم مرحوم فرماتے ہیں:

پاؤں ہم ان کے ایک بار پڑے کو سنے ہم پہ دو ہزار پڑے

تالاب کا کنارہ پریوں کا اکھاڑا سب کی سب نہائی دھوئی، نکھری چوٹیاں مشک و عنبر میں بسی ہوئی کپڑے ریں بوئے زباد و قرنفل گلے میں درج اور حمائل اس پر حرز یمانی کی ہیکل پاؤں میں پازیب اور چھاگل اس پر لپٹتے ہوئے اکثر کبھی سبزہ پر مشق حرام کبھی درختوں کے سایہ میں مقام بنی کندہ کی شہزادیاں یمن کی امیرزادیاں اس میدان میں غزالان صحرائی کی طرح کلیل کر رہی ہیں چوکڑی بھر رہی ہیں بستی میں نہ ا جنگل میں آکر وہ لطف آزادی مل رہا ہے جس بدویت کے آگے مدنیت کے ہزاروں عیش و آرام کو عرب بے حقیقت سمجھتا ہے کہ اس میں سو طرح کی بندشیں ہزار طرح کی پابندیاں سد راہ ہو جاتی ہیں اور کو ہیں کاٹ کر انسان کو کنج حسرت و ناکامی میں قید کر دیتی ہے۔

علامہ کی نثر کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

رسالہ اردوئے معلی علی گڈھ بابت جولائی ۱۹۱۱ء میں مقالات ادب الکاتب والشاعر کی ایک قسط چھپی ہے موضوع مضمون "ترکیب الفاظ" ہے اس میں لکھتے ہیں "یہ تناسب الفاظ بھی مثل تناسب لغات و تناسب اعضا کے

حسن دلاویز رکھتا ہے اس حسن سے عوام نا واقف ہوتے ہیں کاتب و شاعر کو اس امر کا اعتبار زیادہ ہوتا ہے کہ فلاں لفظ اچھا ہے فلاں بُرا فلاں ترکیب بہتر ہے فلاں ترکیب سے .... دو لفظوں کی ترکیب سے کوئی لفظ بامعنی پیدا ہو جائے خصوصاً ایسا لفظ جس میں ذم کا پہلو نکلے یہ امر لکھنو کے شعرانے قابل ترک قرار دیا ہے اور یہ بھی قابل ترک .... قدیم زمانے کا ذکر ہے کہ ایک تازہ وارد شاعر لکھنو کے مشاعرے میں شریک ہوئے مقطع غزل یہ تھا

یہ آرزو ہے شمشیر ناز سے گرنلن ... کوئی غول کی اس رہ گزر پہ دے

سامعین کو تاب ضبط نہ رہی ہر شخص کہتا تھا دوسرا مصرع پھر فرمائیے"

علامہ کے بعض معلومات بہت وسیع تھے جیسا کہ ان کے بعض مضامین سے ظاہر ہوتا ہے یہاں تک کہ کچھ لوگ علامہ کو طبیب سمجھتے تھے رسالہ رفیق الاطبا لاہور کو ایک مضمون بھیجا تو ایڈیٹر نے عنوان مضمون کے نیچے لکھ دیا "از حکیم سید علی حیدر طبا طبائی۔ ایک طبی کتاب پر علامہ کی تقریظ پڑھئے۔

"خدا بری گھڑی سے بچائے جب بلا آتی ہے تو کہہ کر نہیں آتی انسان مورد آفات و مصدر حوادث ہے آئے دن سانحے ہوا کرتے ہیں کوئی گھوڑے پر سے گر پڑا کوئی کوٹھے پر سے آ رہا کسی کا پاؤں ٹوٹا کسی کا سر پھوٹا کوئی ڈوب گیا جل گیا یا دب گیا کچل گیا ایسے شخص کو کس طرح اٹھائیں کیونکر ہوش میں لائیں خون جاری ہو تو کس تدبیر سے روکیں سانس رکی ہو تو کس عمل سے جاری کریں جب تک کوئی طبیب حاذق یا حکیم ماہر علاج کرنے کو

حاضر ہو کیا کرنا چاہیئے۔ ان باتوں کے واسطے یہ کتاب یعنی "چوٹ کھائے ہوؤں کی فوری امداد" ہر شخص کے لئے خاموش معلم و بے زبان استاد کا کام دیگی اگر یہ کوئی یہ نہ جانتا ہو کہ جس کے کپڑوں میں آگ لگ جائے اسے فوراً لیٹ جانا چاہئے تاکہ شعلہ اوپر نہ چڑھنے پائے کروٹوں ہی میں بجھ جائے تو اضطراب میں وہ بھاگتا پھریگا اور ہر ہر قدم پر اشتعال زیادہ ہوتا جائیگا یا نہ بھاگا کھڑا ہی رہا تو بھی آگ کے چڑھ جانے کو زینہ لگا ہوا ہے پائینچے سے دامن دامن سے آستیں آستیں سے رخسار رخسار سے ابرو و جبین تک دم بھر میں پہنچ جائیگی یا کوئی زہر کھا گیا ہو تو پہلے اسے انڈے کی سفیدی پلالیں بعد اس کے کسی معالج کے بلانے کی فکر کریں سفیدی معدے کی حرارت سے منجمد ہو کر زہر میں لپٹ جاتی ہے اور تھوڑی دیر اسے اثر نہیں کرنے دیتی یہ چٹکلے ایسے نہیں ہیں کہ فراموش کر دئے جائیں۔

شکستہ شکل کی ہڈی استخوان موف پر باندھنے کی کتنی صورتیں ہیں اس کا بیان پڑھنے سے وہ لطف آتا ہے جیسا بعض اشکال اقلیدس میں اختلافات نوع کے دیکھنے سے .... سب سے زیادہ خون کو روکنے کا اور سانس کو جاری کرنے کا طریقہ اہم ہے جس کے سمجھانے کے واسطے اس طبیب حاذق نے کئی مقدمات علیہ لکھے ہیں ....

مسئلہ حسب تحقیق جدید اس تفصیل و توضیح سے بیان کیا ہے کہ اگر میں کہوں کہ قانون شیخ و کتاب ابن زہراوی و اضوقی و حاوی ان فوائد سے معطل و معرٰے ہیں تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا اس کے علاوہ .... تقسیم اعصاب و تفصیل عظام کا بیان بھی نہایت خوبی کے ساتھ کیا ہے پھر تسلسل افہام کے لئے ہر اصطلاح کی عربی بلکہ حتی الوسع ہندی بھی لکھدی ہے۔

اردو کی زبان کو یہ ذخیرہ علمی اور مصنف کو شہرت جاوید اور یاروں صحت کی نوید مبارک ہو۔"

ایک دوسری تقریظ مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانہ عجائب کی زبان میں مثنوی ضیائے دکن پر لکھی ہے۔

"یہ مثنوی طراز چہرہ فصاحت ہے رنگ و رخسار بلاغت ہے۔ پھول سے مضمونوں کا گلزار موتی سے معانی کا ہار صفائی بندش کا آئینہ خانہ جواہر مضامین کا گنجینہ رنگین بیانی کا باغ شراب معانی کا ایاغ .... و تاثیر دکن کا مرقع مرے سے آخر تک مرصع لفظیں عطر میں ڈوبی سراسر سلاست و جوشش اسلوبی ایک ایک مصرع موج کوثر ایک ایک ... لفظ نغز و عنبر جیسے موتیوں کی لڑیاں سطریں پھولوں کی چھڑیاں گوہر معنی آبدار مضمون شعلہ بار .... کیوں نہ ہو مصنف اس کے کیسے کہنہ مشق شاعر ہیں رموز بلاغت سے واقف و ماہر ہیں ..... جب ہاتھ میں قلم لیا فوراً مضامین نے جنم لیا جس رنگ میں چاہا زور و شور طبیعت دکھا دیا مضامین آبدار کا دریا بہا دیا جس واقعہ کو چاہا صفائی سے نظم ہو گیا۔"

علامہ نے اپنی تصنیف "نظم طباطبائی" پر جو مقدمہ سپرد قلم فرمایا ہے قلم توڑ دیا ہے غزل کی حمایت میں اور سخن سنجی و سخن فہمی کی باریکیوں پر یہ مقدمہ قیمتی دستاویز ہے اس کی چند ابتدائی مترنم سطریں پڑھئے "ندی کا چڑھاؤ اور پانی کا بہاؤ پیراک کو اور طرف جانے نہیں دیتا یہی حال کلام میں روانی و جوشش کا ہے کہ شاعر کو سیدھا گرینا دریائے عدن تک پہنچا کر

کہتا ہے کہ اب دل کھول کر غواصی کر اور رول رول کر موتی نکال دیکھیے استعارہ دل
اور کتابوں کی تاریکی میں مضمون کی جھلک اس طرح نظر آئے جیسے کالی گھٹا
میں بجلی کوند کر آنکھوں کو خیرہ کر دے یا پچھلے کے اندھیرے میں پو پھٹنے سے
روشنی پھیلے یا ابر گھر کر آئے اور برس کر کھل جائے نسیم سحر کا چلنا جو مستی
ڈالیوں سے سبزہ پر پھولوں کا بکھرنا اس قدر لطف نہیں رکھتا جس قدر
ایک برجستہ شعر سے لطائف کا پیدا ہونا وجد میں لاتا ہے۔ لفظ و ترکیب
کی شان و شوکت حیرت انگیز تو ہے لیکن معانی کی بے تکلفی کچھ دلاویز سے
تاروں کی چھاؤں سہانی ہے لیکن نور کا تڑکا اس سے زیادہ دلکش ہے
یاقوت و زمرد کی چھوٹ آنکھوں کو بھا لیتی ہے لیکن ہیرے کے کنول میں
سیماب کی تڑپ اور ہی عالم رکھتی ہے شعر سے معنی نکلنے کا لطف وہی جانے
جس نے چینی کا کھنکھنا سنا ہو یا بجلی کا چمکنا دیکھا ہو آئینہ میں عکس کا
پڑنا اور ذہن میں معنی کا اترنا دونوں کی ایک ہی سی سرعت ہونی چاہیے
تیر اُسے کہتے ہیں جو ترازو ہو جائے تلوار وہی ہے جو تسمہ لگا نہ رکھے......
صاف شعر کھلا ہوا شگوفہ اور کھلا ہوا نافہ ہے جس کی خوشبو خود بخود دماغ
تک پہنچ جاتی ہے........ برجستہ شعر ہوا چلتا ہوا جادو اور بولتی
ہوئی تصویر...... شعر کا مقتضائے وقت سے مطابق ہونا ایسا ہی اثر
رکھتا ہے جیسے شام کو شفق کا پھولنا ہلال کا نظر آجانا تاروں کا کھلنا صبح
ہوتے نسیم سحر کا چلنا سہیل کا جھلملانا زہرہ کا طلوع کرنا کچھ کم دن رہے
فواروں کا چھوٹنا کچھ رات رہے تاروں کا ٹوٹنا پچھلی رات کی نیند میں
کوئل کا کوکنا آبشار کا لوری دینا دوپہر کو ابر کا آجانا موروں کا شور کرنا
دل کو بے چین کر دیتا ہے اس کی کیفیت کے بیان کرنے کو الفاظ نہیں

ملتے ہاں طرز بیان کچھ ظاہر کر رہا ہے۔"

مقدمے کے خاتمہ پر فرماتے ہیں۔" ان چند سطروں میں جو کچھ میں لکھ گیا ہوں کوئی غور کرے گا تو ایک ایک فقرے سے فن بلاغت کا ایک ایک باب نکال لیگا۔" ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں" زمانہ میرے کلام کا حاجتمند ہے۔" ایک اور جگہ ارقام فرماتے ہیں" تخمیس و عروض میں نے ایک عجیب و غریب رسالہ لکھا ہے۔" پھر اور ایک مقام پر لکھتے ہیں" میں نے یہ دو نو شرحیں غالب و امرؤالقیس لکھکر اپنی زبان کو بڑی رونق دی ہے۔" ساقی نامہ شتقشتغیہ کے خاتمہ پر لکھتے ہیں" دکن کے آنے والوں میں ظہوری میرا ہم عصر و ہم سخن اور ہم زبان و ہم فن گذرا ہے۔ اس سے پہلے اس نے بھی ایک راگ گایا تھا لیکن میری اس کی دھن میں بڑا فرق ہے وہ ترانہ مشاعرانہ ہے اور یہ ارشاد واعظانہ وہ زمزمۂ حریفاں ہے یہ عبرت کدۂ عزیزاں وہ سراپا مجاز یہ معنی" ذی حجہ ۱۳۰۱ھ

سطور بالا سے ظاہر کہ علامہ کو اپنے کلام و کمال کی برتری کا شدید احساس تھا اور یہ احساس بالکل بجا تھا کیونکہ اتنی صحیح اور شستہ اردو لکھنے اور بولنے والا کوئی دوسرا ادیب ہندوستان بھر میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ میرا تنہا دعوےٰ نہیں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ علامہ کی تصنیفات کا غائر مطالعہ کرنے پر ناظرین کو میرے قول کی حقیقت معلوم ہوگی۔ اسی احساس برتری کے باوجود علامہ اپنی بیش بہا تصنیفات کے بارے میں کس حسرت سے تحریر فرماتے ہیں کہ" میری کسی تصنیف کی ملک نے قدر نہ کی احباب کی قدرشناسی کے طفیل میں کچھ کلام دیوان کی صورت میں جمع ہوگیا اور ملک کی ناشناسی کے سبب سے تصنیف و تالیف کی بہت آرزوؤں کا خون

ہوگیا" (رسالہ زمانہ خود نوشت حالات)۔

مشاعروں میں شرکت

علامہ کو اوائل ہی میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا اس کے اسباب پر خود روشنی ڈالتے ہیں کہ

"مولوی محمد مہدی صاحب ادیب ابتدا میں آفتاب الدولہ قلق کے شاگرد ہوئے اور اشرف آباد میں بڑے تکلف کے مشاعرے ان کے ہاں ہونے لگے میں اس زمانے میں پرانے حیدر گنج میں رہتا تھا ان مرحوم کے اصرار سے مشاعروں میں شریک ہونے لگا فارسی میں عرفی ظہوری اور طغریٰ وغیرہ پڑھ چکا تھا ان کے مضامین شاعری کے لئے ہیولے بن گئے تمام شہر کو شاعری کی وہ چاٹ تھی کہ سخن سنجی کو بڑے بڑے لوگ مایہ نازش خیال کرتے تھے مٹیا برج میں حامد علی مرزا مرحوم نے مشاعرے شروع کئے ہر مہینے کی گیارہ تاریخ سر شام ہی شاعروں کو دروازوں پر جو بدمعاد ملکتے تھے کہ چلئے صاحب عالم یاد فرماتے ہیں میری زبان پر جو فارسی عربی پڑا تھا کہ تعقید کا تو بالکل حس ہی جاتا رہا تھا اور آمیزش کو اچھا نہ جانتا تھا اس سبب سے شعر گوئی کی طرف طبیعت مائل نہ ہوتی تھی اور بہت کم کہتا تھا اسی اثنا میں مرزا غالب کا دیوان اول اول لکھنو سے چھپ کر نکلا اور اس بات کا فیصلہ ہو گیا کہ اردو کو بغیر فارسی کی استعانت کے چارہ نہیں پس میرا قلم بھی چل نکلا پھر شعر کہنا دھر یہ قیامت کہ مرزا علی عہد ہو گئے اور جواں مر گئے مٹیا برج ماتم کدہ ہو گیا شعر کہنے کی طرف سے اکثر لوگوں کی طبیعت افسردہ ہو گئی میں نے یک قلم فکر شعر ترک کی"۔

لیکن جب علامہ مٹیا برج سے آکر حیدر آباد میں ملازم اور متوطن ہو گئے تو یہاں دیکھا کہ استاذ السلطان مرزا داغ دہلوی کا طوطی بول رہا ہے شعر و سخن کے گھر گھر چرچے اور جا بجا مشاعرے ہوتے ہیں اقم الدولہ

ظہیر دہلوی یہ راگ الاپ کر کہ

بلبل وہ ہیں تو طوطی ہندستاں ہیں ہم ہم بھی جناب داغ کے ہمدرس ہیں ظہیر

تحسین کلام حاصل کر رہے ہیں امیر مینائی کی حیدر آباد میں آمد کی خبریں پھیل رہی ہیں تو علامہ کا دل شوق سخن سنجی پھر تازہ ہو گیا اور فکر سخن آغاز کی۔ مشاعروں میں شریک ہونے لگے اور غزلیں نظمیں قصیدے قطعات رباعیات تاریخیں اور تضمینیں مسدسات و مخمسات تصنیف کرنے لگے بعض تنقیدیں بھی کتب پر لکھی ہیں۔

علامہ مشاعروں میں یک رخ بیٹھتے جب کوئی چونکا دینے والا شعر سنتے تو شاعر کی طرف دیکھتے شاعر کے حق میں یہ داد کی معراج ہوتی علامہ نے بعض مشاعروں کا حال قلمبند کیا ہے ان میں ایسے مشاعروں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو تہذیب و تمیز کے منافی اور درہم برہم ہو جایا کرتے تھے ایسے ہی ایک مشاعرہ کا حال سنئے "حیدر آباد کے ایک اور مشاعرے کا برہم ہونا مجھے یاد آیا مرحوم میر باقر حسن ضیا لکھنوی بانی مشاعرہ تھے طرح کچھ نہ تھی سر آسماں جاہ بہادر کی وزارت کا زمانہ تھا شمس العلما مولوی حالی صاحب کے سننے کے لئے یہ صحبت منعقد ہوئی تھی مگر یہاں کے سب چیدہ شاعروں کو میر باقر حسن نے بہت اہتمام سے بلایا تھا سامعین میں ایسے ایسے لوگ تھے جو بہت کم شعر و سخن کی صحبتوں میں شریک ہوتے — نواب عماد الملک نواب وقار الملک[۱] مولوی مشتاق حسین صاحب مولوی عزیز مرزا صاحب

---

[۱] نواب وقار الملک نواب عماد الملک مولوی عزیز مرزا تینوں مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے مگر ذوق سخن رکھتے تھے اور بلا کے سخن فہم تھے نواب وقار الملک (بقیہ حاشیہ ص ۹۴ پر

میر باقر حسین نے حیدر آباد کے لنگر کا حال نظم کیا تھا وہ پڑھا مولوی حالی صاحب نے ہندوستان کے پھوٹ پر اور کالے گورے کے مقابلہ پر دو ایک نظمیں پڑھیں اس کے بعد مرزا داغ نے دو غزلیں سنائیں پھر میری باری آئی دو غزلیں میں نے بھی پڑھیں اس کے بعد مشاعرہ برہم ہو گیا مولوی مشتاق حسین صاحب کے اُٹھتے ہی سب اٹھ کھڑے ہوئے اکثر لوگوں نے صاحب مشاعرہ سے شکوہ کیا انہوں نے کہا میں تو مستعفی کے لئے تیار ہوں مگر سامعین پر میرا کیا بس ہے سب لوگ کبیدہ خاطر اٹھے جن میں گرامی و عرشی دربار شاہی کے فارسی گو خوش فکر شاعروں میں تھے۔"

شاعری میں اپنی آئندہ فرصت میں علامہ کی شاعری پر تفصیل سے کہوں گا یہاں چند اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں علامہ نے علم و ادب کے گہوارے میں پرورش پائی اور شعر و سخن کے ماحول میں آنکھ کھولی علامہ نے جب اپنے اطراف و اکناف میں دیکھا کہ ہر شخص کے دل میں شعر کہنے یا شعر سننے کی چیٹک ہے تو شعر گوئی شروع کی اور فن شعر کو اس درجہ کمال تک پہنچایا کہ ان مخصوص ہستیوں میں شمار ہونے لگا جن کے دم سے فن شعر زندہ ہے ہندوستان

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ مشتاق حسین صاحب بار ایٹلا نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک دفعہ انہوں نے اپنے والد ماجد سے پوچھا کہ "آبا جان کیا آپ نے کبھی کوئی شعر کہا ہے" تو جواب ملا کہ "ہاں میں نے شعر کہے ہیں اور میرا تخلص ضیا ہے" لیکن بالتحقیق کوئی ایک شعر بھی دستیاب نہیں۔ مشتاق احمد صاحب کے برادر علاتی مولوی مظاہر الاسلام صاحب مرحوم نے یہ شعر نواب وقار الملک سے منسوب کیا ہے واللہ اعلم

آرام کو پوچھو تو یہاں ہے یا نہ وہاں ہے   اک آگ لگا دیتے ہے کہ ہر سمت رواں ہے

کے ہر گوشے میں استاد و مسلم الثبوت مانے جانے لگے لیکن اپ کمال شاعری کی جانب زیادہ اعتنا نہ تھی۔ عمر کے بیشتر حصے میں سائنسوں و فلسفہ کا مطالعہ کرتے رہتے اور انہیں موضوعات پر بہت سے مقالے لکھے۔ علامہ کا عقیدہ تھا کہ قوم کے حق میں کسب فنون زیادہ مفید و کار آمد ہے چنانچہ اپنے ایک فرزند سید محمد کو عربی پڑھا کر سائنس کی تعلیم دلائی اور علم ہیئت کا چسکا لگایا۔ سید امجد صاحب کے نام یمین السلطنت مہاراجہ بہادر نے تیس روپے ماہوار کا تعلیمی وظیفہ جاری کیا تھا جس سے انہوں نے علی گڈھ کالج میں تعلیم پائی اور بی ایس سی کا امتحان کامیاب کر لیا۔ اور حیدر آباد میں لکچرار سائنس کالج جاگیرداران میں مقرر ہوگئے۔

علامہ کو تمام اصناف سخن پر قدرت تامہ حاصل تھی غزل نظم قصیدہ رباعی مثنوی ترکیب بند قطعہ مرثیہ مسدس مخمس ترجیع بند وغیرہ میں کوئی صنف سخن ایسی نہ تھی جس پر قلم نہ اٹھایا ہو اس پر مستزاد یہ کہ انگریزی عروض کو اردو میں اس خوبصورتی سے سمویا کہ تعریف نہیں ہو سکتی کلام میں انگریزی شاعری کی جھلک نظر آتی ہے مشہور تاریخی مشاعرہ جو بمقام لاہور [illegible] میں منعقد ہوا تھا اس میں مولانا حالی مولانا آزاد مولانا ارشد گورگانی نے غزلوں کے عوض مختلف عنوانات پر نظمیں سنائی تھیں جس سے اردو شاعری کی کایا پلٹ گئی یہ انقلاب انگریزی شاعری کے اثر سے ہوا تھا جب اس مشاعرہ کی روداد ملک میں پڑھی گئی تو شعراء کو نئی نئی راہیں سوجھنے لگیں نئی شاعری کا جو دور انگڑایا گیا تھا اس کا اولین ثمر ڈاکٹر سر اقبال کی شکل میں نمودار ہوا اس انقلاب انگیز مشاعرہ کے بعد یہ سوال سامنے آیا کہ آیا بے قافیہ نظموں کا رواج اردو میں ممکن ہے مگر کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ بے قافیہ نظم لکھنے کی پہل کرے

علامہ ہی نے سب سے پہلے اسی کی طرف توجہ منعطف کی بلانک ورس میں نظم لکھی جس کا ایک بند یہ ہے

رامش گہر تازہ مشق گویا تھا مستلم ۔ جو قیافہ کی تال پر کرتا تھا رقص
موقوف ہوئی تال تو بھولا ہے ناچ ۔ حیران کھڑا ہوا ہے انگشت بر لب

شکسپیر کی ایک نظم "پورشیا کی تقریر رحم پر" کا ترجمہ بلانک ورس میں کر کے لاہور کے مشہور رسالہ مخزن کو بھیجا تھا مگر وہ دفتر میں تلف ہو گیا دوبارہ ترجمہ کر کے علامہ نے مجھ کو عنایت کیا یہ ترجمہ بعنوان رحم حیدر آباد دکن کے رسالہ تحفہ بابتہ شعبان و رمضان ۱۳۴۲ھ جلد ۲ نمبر ۹ و ۱۰ میں جو کچھ عرصہ تک میری ادارت میں نکلتا تھا اور اب بند ہے شائع ہو گیا ہے۔

علامہ کو اردو شاعری کی بلانک ورس کا موجد کہنا بے جا نہ ہوگا دوسرے شاعروں کے برعکس جن کے نزدیک ایشیائی فن شاعری کے قدیم اصول و قواعد آیات و احادیث کی طرح ناقابل ترمیم ہیں علامہ نے اردو شاعری کو موجودہ زمانے کے معیار پر لانے کی کوشش کی۔ علامہ اگرچہ مشرقی وضع کے بزرگ دکھائی دیتے تھے اور بادی النظر میں عصر حاضرہ سے بے خبر معلوم ہوتے تھے لیکن جتنے مشرقی نظر آتے تھے اس سے زیادہ مغربی علوم و فنون کے دلدادہ اور خود مغربی کمال کے مظہر تھے۔ اسی باعث شاعری میں سنجیدہ ترقی پسندی کی بنا ڈالی۔

ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے اہل قلم نے اگلی عظمت و شان و شوکت و سطوت کے نوحے لکھے ہیں جن میں سب سے نمایاں بقول مولانا حالی کی طویل نظم مد و جزر اسلام یا مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے ممکن نہ تھا کہ علامہ بھی قومی زوال سے متاثر نہ ہوتے چنانچہ ساقی نامہ شققیہ لکھا

اس میں ایسے مطالب بیان کئے اور ایسے معلومات کا اظہار کیا ہے کہ یہی ایک غزنوی علامہ کے فضل و کمال کا کافی ثبوت ہے اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے علوم فنون میں جو ترقی کی تھی وہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر محیط تھی محض ادب یا تاریخ ہی موضوع نہ تھا سائنس اور فلسفے میں وہ گلکاریاں کیں جنھیں دیکھ کر دل و دماغ روشن ہو جاتے ہیں اور اسلامی عظمت کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے یہ غزنوی عبرت کا مرقع ہے
۱۹۰۸ء میں حیدر آباد دکن میں طوفان باد باراں قہر الٰہی کی شکل میں نازل ہوا تین روز تک جھڑی لگی رہی مینہ تھمنے کا نام لیتا تھا موسیٰ ندی میں ایسی زبردست طغیانی آئی کہ پانی کی موجیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں معلوم ہوتا تھا کہ موجیں نہیں پہاڑ لڑھک رہے ہیں ندی کے جوش و خروش اور تباہ کاری کا وہ عالم تھا کہ ہزاروں بندگان خدا ہلاک یا خانماں برباد ہو گئے اور سینکڑوں مکان منہدم ہو گئے اس سے متاثر ہو کر علامہ نے شہر آشوب لکھا ہے۔ فرماتے ہیں

اے ہم سفران دشت غربت ہشیار
جاگو کہ نمایاں ہیں سحر کے آثار
چپ ہو کہ ضرر ہے سوتے رہنے میں ہزار
اٹھو کہ سیلاب کی ہے رہ گذار

یہ کالبد بشر ہے اک پردہ ساز
اور تار نفس یہ دے رہا ہے آواز
ہر ایک قدم پر ہے نشیب اور فراز
بیہڑ کا یہ رستہ ہے غافل ہشیار

دو دن کی زیست اور دھندے لاکھوں
انساں کا گلا ایک ہے پھندے لاکھوں
خود زیست سے بیزار ہیں بندے لاکھوں
سچ پوچھو تو زندگی ہے خود ایک آزار

گردوں نے قریب صبح الٹا یہ ورق — صدمے سے زمین کے جگر ہو گیا شق

جس جا تھی فصیل اب وہاں ہے خندق — پانی کی اٹھی تھی قد آدم دیوار

آئی ہوئی ٹلتی ہے کسی کے ٹالے — چلتا نہیں بس فلک جو آفت ڈالے

اس طرح سے بہہ رہے تھے مرنے والے — پانی پہ مرغابیوں کی جیسے قطار

اے سیل آب آخر کو پشیماں ہو کر — کیا روتی ہے تو چاک گریباں ہو کر

جب رہ گیا نصف شہر ویراں ہو کر — ٹکراتی ہے سر کو پتھروں سے بے کار

علامہ کو قصیدہ گوئی میں بڑا کمال حاصل تھا تشبیب ایسی پرزور کہتے ہیں کہ قاآنی اور انوری کا گمان ہوتا ہے انصاف کی بات یہ ہے کہ ذوق و غالب کے بعد علامہ کے قصیدوں سے بہتر اردو زبان میں بہت کم قصیدے لکھے گئے ہیں معراج پر جو قصیدہ لکھا ہے بے مثل ہے اسکی تشبیب کے چند شعر سنئے۔

ہے ابر یا دیو سیہ سرشار و مست و خشمگیں

خنداں رخ و گریہ مژہ روشن دل و تیرہ جبیں

پھولوں میں انبار جنوں تیوروں میں شور ارغنوں

باہم ہوا ہے تیرہ گوں صحن گلستان زمردیں

گریہ کناں گوہر فشاں قطرہ زناں دامن کشاں

مانند زلف مہوشاں تاریک و تار و عنبریں

دل میں طرب لب پر فغاں سر برکف و کف دہاں

انداز میں پیل دماں آواز میں شیر عریں

دیوانہ و شوریدہ سر دیو سیہ مست الحذر

پرچھائیں جس کی دیکھ کر چھپتا پھرا مہر مبیں

ہے وحشت دل اک بلا اور موسم گل فتنہ زا
ہو جائے یوں ہر ذرۂ کہسار کا عزلت گزیں
کشتی ہے یہ لنگر زدہ اژدر ہے یہ چنبر زدہ
یا کوہ دامن برزدہ اوج ہوا پر ہے کہیں
وسعت یہ دیکھو تو سہی خالی نہ کوئی جا رہی
گردوں سے کہتا ہے یہی اب میں نہیں یا تو نہیں
کچھ جھوم کر آنا بھی ہے کچھ چال مستانہ بھی تو ہے
دریا پہ لہرانا بھی ہے بکھرا کے زلف عنبریں

لمعۂ فکر پر جو پرزور قصیدہ لکھا ہے اس میں فلسفہ کے دقائق کو پانی کرکے بہایا ہے وجود و عدم کی بحث میں فرماتے ہیں۔

کہاں سے کھینچکر وارفتگی مجھ کو کہاں لائی
میں ہوں راز نہفتہ اور جہاں بازار رسوائی
نے مکاں کی بیڑیاں کیوں پاؤں میں ڈالیں
تسلسل نے زباں کی کیوں مجھے زنجیر پہنائی
گزرگاہ جہاں دیکھو یہ رنگ آسماں دیکھو
مجھے باور نہیں آتا کہ ہو سیلاب پر کائی

میرزا غالب بعض اوقات ایک کے نام کا قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیتے تھے علامہ نے بھی مٹیا برج میں نواب واجد علی شاہ تاجدار اودھ کی مدح کہی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے۔

ہو جہاں روشن چراغ عدل تیرے نام سے
سجدہ کرنے کو ہمایوں آئے گر کر بام سے

اس قصیدہ کو حیدر آباد میں شاہ دکن نواب میر محبوب علی خاں کے نام پر کر دیا جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے۔

گر یقیں آتا نہیں تجھ کو تو کر نالش مری　　میر محبوب علی خاں خسرو اسلام سے

لیکن جب کتاب "نظم طباطبائی" چھپی تو یہ قصیدہ پھر تاجدار اودھ ہی کے نام پر برقرار رکھا۔ اس طرح کے قصیدوں کی منتقلی کو شاعر کی ضرورت سمجھو یا تلون یا مزید دماغ سوزی سے بچنے کی سعی بہرحال کبھی کبھی اتفاق ہو جاتا ہے اور شاعر حسب ضرورت وقت ایسا عمل کر لیا کرتے ہیں۔

علامہ کی غزلیں روایتی شاعری پر مبنی ہیں مگر صحت زبان اور محاورے کے لحاظ سے بے مثل ہیں، چند شعر درج ذیل ہیں۔

آپ کی محفل میں اگر دل کھدے لے چلا　　آئینہ لایا تھا میں سد سکندر لے چلا۔

مٹا دی اس نے ہستی آستینوں کو اگر الٹا
عدم کا اٹھ گیا پردہ جو داماں تا کمر الٹا

جلے ہیں غیر کیا کیا وہ جو خلوت سے مری نکلے
پریشاں باندھ کر گیسو ڈوپٹا اوڑھ کر الٹا

رنگ خوں اشک میں گہرا نظر آتا ہے مجھے　　جان دینے میں بھی کھٹکا نظر آتا ہے مجھے
آج وہ اوڑھ کے نکلے ہیں ڈوپٹہ آبی　　آسماں رنگ بدلتا نظر آتا ہے مجھے

سن غلے نا نفس بازپسیں کی آواز
جان دینے میں بھی کھٹکا نظر آتا ہے مجھے

دو رباعیاں ملاحظہ ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انیس نے کہی ہیں۔

دل کی حرکت کو اضطراری سمجھو
یہ طائر جاں کی بے قراری سمجھو
ہے عمر بشر چند نفس کی میعاد
جینے کو فقط نفس شماری سمجھو

مجمع معنی برجستہ ہیں سب بندھتے ہیں
جب بندھتے ہیں مضموں عجب بندھتے ہیں
میں کم سخن اس سے ہوں کہ شیریں ہے کلام
کھلتی ہے اگر زبان تو لب بندھتے ہیں

سید احمد صاحب فرزند علامہ کا بیان ہے کہ کشن راؤ صاحب مشترک تہذیب کے نمائندے علامہ کی خدمت میں اکثر حاضری دیتے اور چھوٹی چھوٹی نظمیں اور قطعے از قسم مطائبات لکھوا کر لے جاتے اور اپنے اخبار دکن پنچ میں جو اخبار مشیر دکن کا ضمیمہ تھا شائع کرتے تھے جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

راجہ رنجیت سنگھ

نہیں پروا اگر یک چشم اور فالج زدہ ہوں
کہ دہنی آنکھ دہنا پاؤں دہنا ہاتھ رکھتا ہوں
سوار یکہ تاز و تیغ زن مجھ سا نہیں کوئی
تو میں شبدیز تیغ تیز اپنے ساتھ رکھتا ہوں

سروپ لکھا

رام سے وصل کی تجھے ہے طمع
رام ہیں آفتاب زہد و ورع

تو ہے خفاش دیکھ دھوپ نکھا

ہے جو سیتا سے بغض دکیں تجھ کو خوف لچھمن کا بھی نہیں تجھ کو

ناک کٹ جائیگی سروپ نکھا

مینڈکی کو بھی لو زکام ہوا

مینڈکی سے کیا کسی نے سوال لیڈری کا ہے کیا تجھے بھی خیال

تیری آواز جو سن پاتے ہیں اوڑ کے کیڑے مکوڑے آتے ہیں

لقمہ ہو جاتے ہیں ترا وہ غریب پیٹ بھرنے کی عجب ترکیب

ناتجربے جا ہے ایسی ٹرٹر پر کچھ بھی تجھ کو بسنت کی ہے خبر

بولی وہ سچ ہے کیا خبر تجھ کو

ہے زکام اور درد سر مجھ کو

میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ دارالترجمہ میں علامہ کا دوبارہ تقرر بلا تعین مدت ہوا تھا۔ یہاں چھ سال تک علامہ وضع اصطلاحات کی کمیٹیوں میں شریک ہوتے رہے اور اصطلاحوں کے ساعت میں حصہ لیتے رہے۔ مولوی عبدالحق بابائے اردو مولوی وحیدالدین سلیم مولوی سید ہاشمی فرید آبادی بھی کمیٹیوں میں شرکت کرتے تھے مگر یہ تینوں اصحاب علامہ کے تبحر کو نہیں پہنچتے تھے۔ اس میں شک نہیں مولوی سلیم نہایت ذہین اور طباع شخص تھے اور اپنی گھڑی ہوی اصطلاحوں کو رواج دینے پر مصر رہتے تھے لیکن علامہ سے مسکت جواب سنتے تو خاموش ہو جاتے مولوی سلیم نے اپنی کتاب وضع اصطلاحات میں توسیع و ترقی زبان اردو کے بارے میں بعض

اچھے مشورے دیے ہیں اور بعض بے معنی۔ کتاب کے مفید ہونے میں کلام نہیں مگر ادیبوں نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی سلیم کی اصطلاحیں اور الفاظ بجز ایک دو کے کسی کی زبان پر نہ چڑھے علامہ کی نظر کے سامنے سے زمین و آسمان کے پردے اٹھ گئے تھے۔ علامہ ایک کوہ علم و علم و وقار تھے جن کو ہلانا جوئے شیر لانا تھا۔ تینوں اصحاب مذکورہ بالا میں ایک ہاپوڑی دوسرے پانی پتی تیسرے فریدآبادی تھے اظہر من الشمس ہے کہ یہ اصحاب ثلاثہ علامہ جیسے لکھنو کے مستند اہل زبان جامع الکمالات اور یگانہ روزگار سے کیا سر کھپ ہوتے۔ آخرش ان تینوں کو علامہ کا لوہا ماننا پڑا۔

چھے سال کے بعد دارالترجمہ سے قطع تعلق ہوا مگر علا دارالترجمہ نے علامہ کو نہیں چھوڑا اور وفات سے ایک دن پہلے تک وضع اصطلاحات کمیٹیوں میں شریک ہوتے رہے افسوس صد افسوس کہ تاریخ ۸ مئی ۱۹۳۳ء بروز سہ شنبہ صبح کے پانچ بجے مشرقی علم و فضل کی یہ شمع موت کے باد تند سے بجھ گئی اور علمی حلقوں کو سیہ پوش کر گئی اخبارات و رسائل میں تعزیتی مضامین نثر و نظم شائع ہوئے نظام کالج میں ایک بہت بڑا جلسہ تعزیت منعقد ہوا جس کی صدارت یمین السلطنت مہاراجہ بہادر شاد نے فرمائی راقم نے ایک مرثیہ پڑھا۔ علامہ کے علمی کارنامے قیامت تک دلدادگان ادب کے لیے مشعل راہ رہیں گے اور انہیں منزل مقصود تک پہنچانے میں ممد و معاون ہونگے۔

آخر میں مجھے رسالہ اصطلاحات غالب کے متعلق ایک دو کلمے کہنا

ضروری ہے غالب کی اصلاحیں دوسرے شاعروں کے کلام پر نہیں ہیں
بلکہ خود اپنے اشعار پر غور و فکر کے ساتھ نظر ثانی میں کی ہیں کہیں کسی شعر کو
دیوان میں اصلاح کے بعد رکھا ہے جیسے

پوچھ مت بیاری غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خون دل بے منت کیموس تھا

(اصلاح) کیا کہوں بیاری غم کی فراغت کا بیاں

علامہ لکھتے ہیں "پوچھ مت ...... الخ اس میں مت کا لفظ ترک
کر کے یوں بنایا ...... کیا کہوں ...... الخ اب بھی یہ شعر کاٹ دینے کے
قابل تھا مگر مصنف کا قلم نہ اٹھا اس وجہ سے کہ ایک علمی اصطلاح اس میں
آگئی تھی"

کہیں دیوان میں رکھنے کے شعر کو حذف کر دیا ہے جیسے

جو شخص بے کیفیتی ہے اضطراب آبلا اسد
ورنہ بسمل کا طپیدن لغزش مستانہ تھا

(اصلاح) ورنہ بسمل کا تڑپنا لغزش مستانہ تھا

علامہ فرماتے ہیں ...... ابتدائے مشق میں مصنف کو
طپیدن کا لفظ اردو میں بجانہ معلوم ہوا ان کے کلام منتخب میں بھی سوختن
و شنیدن و فسردن موجود ہے لیکن نظر ثانی میں اس مقطع سے طپیدن کا
لفظ کاٹ کر اضطراب انگیز بنا لیا غرض ایک ایسا خلاف محاورہ لفظ
اس بیت میں باقی رہ گیا تھا کہ انتخاب کے وقت اسی پر نظر پڑی کہ سارا
شعر ہی دیوان سے مصنف نے نکال ڈالا لیکن کسی سخن شناس کے
دل سے نہیں نکل سکتا لوگ اس شعر کو اس طرح یاد رکھیں گے"

جوشِ بے کیفیتی ہے اضطراب انگیز اسد
ورنہ بسمل کا تڑپنا لغزشِ مستانہ تھا

علامہ کے تبصرے جواہر پارے ہیں جتنی غائر نظر سے یہ پڑھے جائیں گے اتنے ہی زیادہ ان کے محاسن روشن ہو نگے۔ میں ان تبصروں پر کیا قلم اٹھاوں استاد کی نگارشات ہیں ویسے ادب بھی مانع ہے کہ کچھ خامہ فرسائی کروں اس لیئے قارئین کرام خود علامہ کے جواہر ریزوں کو پرکھیں اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں۔

علامہ کے جو حالات و واقعات اوپر مندرج ہیں ان کو میں نے تا بحد امکان مستند بنانے کی کوشش کی ہے کیونکہ

(۱) بہت قریب رہنے اور شرف تلمذ رکھنے کی وجہ سے بہت سی باتیں علامہ کی زبانی سنی ہیں۔

(۲) بہت سے واقعات علامہ کے فرزند سید امجد صاحب سے معلوم کئے ہیں۔

(۳) بہت سے حالات اپنے حقیقی بھائی مولوی عبدالستار ایم اے رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی سے سنے ہیں کیونکہ وہ علامہ کے رفیق کار اور قریب ہیں۔

(۴) بہت سی باتیں خود علامہ کی تحریرات سے اخذ کی ہیں۔

(۵) مجھے اپنے فرزند محمد اقبال سلمہ متعلم پالی ٹکنیک الکٹرسٹی ڈپلما کورس سے مواد کی فراہمی میں اور اپنی دختران ناہید فاطمہ بی اے و انور فاطمہ بی اے سے یادداشتوں کی ترتیب میں مدد ملی ہے۔

با ایں ہمہ ممکن ہے کہ مجھ سے کہیں قلمی لغزش ہوی ہو تو ارباب

سخن اور اصحاب ذوق سے التماس کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو محل نظر اندراجات سے مطلع کر کے ممنون فرمائیں تاکہ میں اس رسالہ کے دوسرے ایڈیشن میں تصحیح کرلوں وما توفیقی ......

بعض احباب چاہتے تھے کہ میں اپنے حالات بھی قلمبند کردوں مگر کیا لکھوں جب کہ میں مصداق ہوں اس کا کہ

صد شکر کہ جز عجز گیا ہے نہ دمیدیم
ذرے نہ دمیدیم دکلا ہے نہ دمیدیم

یکم ڈسمبر ۱۹۶۷ء
۱۱-۶-۶۳ لال ٹیکری
حیدرآباد دکن آندھراپردیش

ہیچمداں محمد عبدالرزاق راشد ایچ سی ایس
موظف سینیر ڈپٹی کنٹرولر جنرل کونسل ور آڈٹ
حکومت حیدرآباد دکن آندھراپردیش

صفحہ ۱

آتشیں پا ہوں گدازِ وحشتِ زنداں نہ پوچھ
موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یاں زنجیر کا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

آتشیں پا اور آتش زیرِ پا کا ایک ہی مطلب ہے۔ ان میں کا ایک لفظ حلقۂ زنجیر کو موئے آتش دیدہ بنانے کے لیے کافی تھا۔ پھر گدازِ وحشتِ زنداں کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ اس سے معنی میں اُلجھن پیدا ہو گئی تھی کہ آیا حلقۂ زنجیر کو آتشیں پا ہونے سے موئے آتش دیدہ کا وصف حاصل ہُوا ہے یا گدازِ وحشت کے سبب سے۔ مصنف نے گدازِ وحشت کو نکال ڈالا۔ اب مطلب صاف ہو گیا۔

صفحہ ۲

بہ استقبال تمثال زمہ اختر فشاں شوخی
تماشہ کشورِ آئینہ میں آئینہ بند آیا

مہِ اختر فشاں کی بہرِ استقبال آنکھوں سے

شعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ شوخ جو ماہ سے ستارے گرانے والا ہے (یعنے افشاں کے ستارے یا پسینے کے قطرے) اُس کے عکس

کے استقبال کرنے کو کشورِ آئینہ میں تماشا آئینہ بندی کر رہا ہے۔
آئینہ بند آرائش کرنے کے معنیٰ پر فارسی میں مستعمل ہے۔ اردو
والے اس لفظ میں تصرف کر کے آئینہ بندی کہتے ہیں۔ لیکن اس
مصرع میں۔

ع باستقبال تمثال زمہ اختر فشاں شوخی۔ اس قدر گنجلک تھی کہ
مصنف نے اس طرح بدل دیا۔ ع مہ اختر فشاں کے بہر استقبال
آنکھوں سے یعنے خود اس کے استقبال کے لیے تماشا کشورِ آئینہ میں
آنکھوں سے آئینہ بندی کر رہا ہے۔ تماشا بمعنیٰ نظارہ فارسی کا محاورہ
ہے۔ آئینہ میں وہی اختر ہیں جو مہ میں سے ٹپک رہے ہیں۔ اصلاح
کے بعد بھی شعر میں اُلجھن رہ گئی۔ دیوان سے نکال ہی ڈالا۔

صفحہ ۳

سوادِ چشمِ بسمل انتخابِ نقطہ آرائی
خرامِ نازِ بے پروائیٔ قاتل پسند آیا
روانی ہائے موجِ خونِ بسمل سے ٹپکتا ہے
کہ لطفِ بے تحاشا رفتنِ قاتل پسند آیا

قاتل کے خرامِ ناز پر چشمِ بسمل کا سواد نقطۂ انتخاب ہے۔ اس
مضمون میں ایک تو یہ نقص ہے کہ مردمکِ چشم کو نقطۂ انتخاب باندھنا
چاہتے تھے مگر وزن مانع ہوا۔ دوسرے یہ کہ قاتل خرام سے کیا تخصیص،
اس کی ہر ادا انتخاب کے لائق ہے۔ اس سبب سے اس مضمون
ہی کو ترک کر دیا۔ دوسرا شعر اس طرح موزوں کیا کہ خونِ بسمل کی
روانی سے یہ مضمون ٹپکتا ہے کہ قاتل کا بے تحاشا رواں ہونا اُسے

پسند آگیا ہے۔

جز قیس اور کو نہ ملا عرصۂ تپش
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا
جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار

عرصۂ تپش یعنے تڑپنے کے لیے میدان نہ ملا۔ لیکن تپش کے دوسرے معنیٰ زیادہ مستعمل ہیں۔ اس اشتباہ کے رفع کرنے کو مصنف نے لفظ ہی بدل ڈالا۔

آشفتگی نے نقش سویدا کیا ہے عرض
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست

عرض کیا۔ یعنے۔ ظاہر کیا۔ یہ لکھ کر مصنف کا ذہن اس طرف گیا کہ ظاہر کرنا کیا آشفتگی ہی نے نقش سویدا کو درست کیا۔ اور بنایا جس سے ظاہر ہوا کہ اس داغ کا سرمایہ دود تھا۔ یعنے داغ کا سبب پریشانی تھی۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
مژگاں جو وا ہوئی۔ نہ زیاں تھا نہ سود تھا
جب آنکھ کھل گئی۔ نہ زیاں تھا نہ سود تھا

مژگاں جو وا ہوئی۔ یعنی جب آنکھ کھل گئی۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی بات میں تکلف تھا اور آنکھ کھل جانے سے بے تکلفی میں مطلب ادا ہو گیا۔

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، نادیدنی دعوت
مبارک باد اسد غمخوارِ جانِ دردمند آیا

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں خونِ جگر ہدیہ

غمخوار نے اس ارمغاں کے ساتھ دعوت ایسی دی جو نادیدنی یعنے دیکھنے کے لائق نہیں۔ اس میں یہ شُبہ ہوتا ہے کہ دعوت تو اُسے کرنا تھی جس کو تحفہ وارمغاں اور سوغات ملے ہیں۔ نہ کہ جو سوغات لے کر آیا ہے وہی دعوت بھی کرے۔ اس لحاظ سے مصنّف نے نظرِ ثانی میں لفظ بدل دیا۔

حجابِ سیرِ گل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہری قاتل

اُس نے تماشائے گُل کو اپنی بے رحمی کا پردہ بنایا تھا۔ مگر حجاب کے معنی شرم کے بھی ہیں۔ اس سبب سے مطلب میں اُلجھن پیدا ہوگئی تھی ہوائے سیرِ گل کہنے سے مطلب صاف ہوگیا۔

صفحہ ۴

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک باندھا
آپ سے کوئی پوچھے۔ تم نے کیا مزا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا

نمک چھڑکا ایک عام محاورہ ہے۔ مصنّف نے یہ جدّت کی تھی کہ نمک باندھا نظم کردیا تھا۔ نظرِ ثانی میں اس بات کو محسوس کیا کہ محاورہ میں تصرف کرنا بُرا معلوم ہوتا ہے۔ لفظ کو بدل دیا۔

صفحہ ۵

عشرتِ ایجاد۔ چہ بوے و گل و کو دودِ چراغ
جو تیری بزم سے نکلا۔ سو پریشاں نکلا
بوئے گل۔ نالۂ دل۔ دودِ چراغ محفل

عشرت ایجاد سے طرب انگیز کہنا بہتر تھا۔ مقصد یہی ہے کہ بوے گُل کیا طرب انگیز ہوگی۔ اور دودِ چراغاں کو کہاں یہ وصف حاصل ہے۔ اس معنیٰ میں گنجلک تھی اس کے علاوہ عشرت ایجاد کی ترکیب بھی قابلِ اصلاح تھی۔ مصنف نے نظر ثانی میں دونوں نقص رفع کر دیئے۔ شعر اب کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

شب نظارہ پرور تھا خواب میں خیال اس کا
صبح موجہ گل کو وقف بوریا پایا
صبح موجہ گل کو نقش بوریا پایا

وقف کی جگہ نقش بنا دینے سے کلام میں تشبیہ کا حسن جو پیدا ہوگیا ہے ظاہر ہے۔

صفحہ ۶

تھی نو آموز فنا۔ ہمت دشوارئ شوق
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا
تھی نو آموز فنا۔ ہمت دشوار پسند

پہلی فکر میں "ہمت دشوارئ شوق" تھا۔ پھر نظر ثانی میں "ہمت دشوار پسند" بنایا۔ ایک اضافت کم ہو جانے سے مصرع میں برجستگی پیدا ہوگئی۔ پھر انتخاب دیوان کے وقت مصنف نے ہمت کو مخاطب و منادیٰ بنا لیا۔

یعنے "تھی" کی جگہ "اے" بنا دیا۔ اور اب یہ شعر خبر سے انشا ہو گیا۔
مصنف نے تین مرتبہ اس شعر پہ اصلاح کی نظر کی ہے۔

صفحے

مر گیا صدمۂ آواز سے قم کی غالب
ناتوانی سے حریفِ دم عیسیٰ نہ ہوا
مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب

"قم کے صدمۂ آواز سے مر گیا" پہلی فکر ہے۔ نظرِ ثانی میں اس طرح بدل دیا کہ "صدمۂ یک جنبشِ لب سے مر گیا۔ مبالغہ میں اب زیادہ نزاکت پیدا ہو گئی۔

داغ اے حاجتِ بے درد کہ ندعرضِ حیا
یک عرق آئینہ بر جبہۂ سائل باندھا
حیف اے ننگِ تمنا کہ پئے عرضِ حیا

شعر کا مطلب یہ ہے کہ ننگِ سوال سے جو شرمندگی ہوئی تو اس شرم کے ظاہر کرنے کے لیے سائل کی پیشانی پر پسینہ آگیا۔ اور پسینہ کے قطروں نے اُسکی جبیں پر آئینہ بندی کر دی۔ سقم یہ پیدا ہو گیا کہ شہر میں آئینہ بندی خوشی کے موقع پر ہوتی ہے۔ یہاں تو بے چارہ سائل ذلیل ہو گیا ہے۔ یہ کون موقع آئینہ بندی کا ہے۔ شعر کے نکال ڈالنے کی ایک یہ وجہ ہے دوسرے یہ مضمون بیدل کا ہے۔

؎ بے نیاز یہا بطوفانِ عرق داد احتیاج
کز نم خجلت جبینِ سائلے آراستند

صفحہ ۸

یار نے تشنگیٔ شوق کے مضموں چاہے
ہم نے دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

نہ بندھے تشنگیٔ شوق کے مضموں غالبؔ
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی فکر میں شعر اسی طرح مصنف کے قلم سے نکلا تھا۔ پھر اسی کو مقطع کر دیا۔ شعر کی صورت پہلے یہ تھی کہ یار نے تشنگیٔ شوق کے مضمون کی فرمائش کی مقطعے میں یہ بات پیدا ہوگئی کہ تشنگیٔ شوق کے مضمون کسی طرح بندھ نہ سکے۔ پہلی صورت میں تکلف تھا۔ دوسری صورت میں مبالغہ بے تکلف ہوگیا۔ شعر کے دونوں مصرعوں میں پہلے فصل تھا اب "گرچہ" کا لفظ بڑھا کر مصنف نے مصرعوں میں وصل کر دیا اس کے علاوہ معشوق کا یہ فرمائش کرنا کہ تشنگیٔ شوق کے مضمون باندھو سراسر تصنع تھا۔ یہ سقم بھی نکل گیا۔

صفحہ ۹

جوش یادِ نغمۂ دم سازِ مطرب ہے اسدؔ
ناخنِ غم بر سرِ تارِ نفس مضراب تھا

واں ہجوم نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

پہلی فکر میں مقطع اسی طرح تھا۔ جوش یاد نغمۂ دم ساز... الخ یعنے مطرب کے نغمے کی یاد میں ایسا جوش تھا کہ ناخن غم میرے تارِ نفس پر مضراب کا کام کر رہا تھا۔ خلاصہ یہ کہ مطرب کا گانا یاد کر کے میں فریاد

کر رہا تھا۔ پہلے مصرعے میں اضافتیں اور کسرۂ توصیفی پے در پے بُرے معلوم ہوئے۔ اور دوسرے مصرعے میں "بر سرِ تارِ نفس" تھا یہاں بھی "بر" کا لفظ بے موقع تھا۔ "سرِ تار نفس" کہنا کافی تھا۔ اس سبب سے نظرِ ثانی میں یوں اصلاح کر دی ع واں ہجوم نغمہ ہائے ساز... الخ۔ شاید مصنف کو یہ شُبہ ہُوا کہ بر کا لفظ یہاں غلط ہے۔ یا یہ خیال آیا کہ اُردو میں "بر" اور "در" یعنے فارسی کے روابط کا استعمال بُرا معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال بر کو نکال ڈالنا ہی بہتر ہوا۔ طالب علم کو یاد رکھنا چاہئے کہ فارسی میں سرِ تار نفس اور بر سرِ تار نفس دونوں طرح صحیح ہے۔ اُستاد کا یہ شعر مشہور ہے۔

ے بجرم عشق توام می کشند و غوغائیست
تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشائیست

صفحہ ۱۱

نہ ہو وحشت کش درس سراب سطرِ آگاہی
میں گردِ راہ ہوں بے مدعا ہے پیچ و خم میرا
غبارِ راہ ہوں بے مدعا ہے پیچ و خم میرا

ع میں گردِ راہ ہوں بے مدعا ہے پیچ و خم میرا۔ یعنے گردِ راہ کا پیچ و خم کوئی معنے نہیں رکھتا۔ اس مصرعہ میں مصنف کو "میں" کا لفظ زائد معلوم ہُوا۔ اس سبب سے کہ "ہوں" کا لفظ "میں" پر دلالت کرتا ہے۔ پھر یہ بھی نقص تھا کہ "میں" کا لفظ بندش میں اس طرح آیا تھا کہ فقط میم تقطیع میں باقی رہ گیا تھا۔ ی ں ساقط ہو گئے تھے۔ اس پر نظرِ ثانی میں کیا خوب اصلاح کی ہے۔ ع غبارِ راہ ہوں بے مدعا ہے پیچ و خم میرا۔

اس مصرع کی خوبی میں شک نہیں۔ پھر بھی مصنف نے اس بیت کو اس لیے نکال ڈالا کہ یہ اس کا پہلا مصرع ادائے مطلب سے قاصر تھا۔ یعنے ع

نہ ہو وحشت کش درس سراب سطر آگاہی۔ چار چار اضافتیں بھی اس میں بُری معلوم ہوتی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک بے معنیٰ سطر کے معنیٰ نکالنے میں تو کیوں مبتلائے وحشت ہوتا ہے۔ مَیں ایک غبارِ راہ ہوں۔ میرا یہ مدعا نہیں کہ کدھر جاؤں کہاں بیٹھوں۔ افسوس ہے کہ مصنف نے پہلے مصرعے کو صاف نہ کیا بلکہ شعر ہی کو کاٹ ڈالا۔

صفحہ ۱۲

بعجز آباد وہم مدعا تسلیم شوخی ہے
تغافل کو نہ کر معروف تمکیں آزمائی کا
تغافل کو نہ کر معزول تمکیں آزمائی کا

تغافل کو نہ کر معروف تمکیں آزمائی کا' یعنے عاشق کی آزمایش میں تغافل کو معروف نہ کر یعنے تغافل کو چھوڑ۔ کا کی جگہ (میں) کی ضرورت تھی۔ اس سبب سے مصنف نے معروف کی جگہ معزول بنا دیا۔ یعنے عاشق کی آزمایش سے تغافل کو معزول نہ کر۔ یعنے تغافل کئے جا۔ اب کا کی جگہ (سے) کی ضرورت تھی۔ اس لیے شعر ہی کو کاٹ دیا۔ ان دونوں صورتوں میں مصرعہ اوّل کے ساتھ شاید یہ ربط ہے کہ مدعا کے حاصل ہونے کا جو ہم کو وہم ہے۔ تو تیرے تغافل کو بھی ہم سمجھتے ہیں کہ تو ہم سے شوخی کر رہا ہے۔ اور دل کو بہلا رہا ہے۔ تو ہماری آزمایش میں تغافل کو معروف رکھ یا معزول کر۔ ہم اسے تیری شوخی تسلیم کرتے ہیں۔ وہم مدعا کو عجز آباد سے تعبیر کیا ہے۔ اس شعر کے نکال ڈالنے سے

اس نکتہ پر نظر پڑتی ہے کہ کا ردیف ہے۔ اور ردیف کا اُکھڑ جانا سارے شعر کو بیکار کر دیتا ہے۔ دیکھئے داغ نے اس ردیف کو کس خوبی سے کہا ہے۔ زمین بدلی ہوئی ہے۔

؎ اٹھنا ہی اس کی بزم سے دشوار تھا مجھے
اور پھر سنبھالنا دلِ بے اختیار کا

صفحہ ۱۳

پوچھ مت۔ رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن
دست پابند حنا۔ رخسار رہن غازہ تھا
دست مرہونِ حنا۔ رخسار رہن غازہ تھا

دست پابند حنا پہلے کہا تھا۔ اس میں دست و پا کا ضلع نہایت مبتذل معلوم ہوتا ہے۔ یہی باعث ہوا کہ پابند کا لفظ نکال کر مصنف نے مرہون کا لفظ بنا دیا۔

دیدۂ تر نے دیئے اوراق لختِ دل بہ آب
یادگارِ نالہ۔ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا
نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد

پہلی فکر میں مصنف نے اس طرح مصرعہ لگایا تھا۔ دیدۂ تر نے... الخ
شاید اس میں شبہ ہوا کہ مقصود تو اوراقِ دل کا برباد ہونا ہے۔ اصلاح یہ کی کہ نالۂ دل نے... الخ مگر اب نالہ کا لفظ مکرر ہو گیا اور تکرار بے لطف ہے۔ راقم کے نزدیک یہاں پہلا ہی مصرعہ بہتر تھا اور بآب دادن کا حاصل بھی بباد دادن ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

؎ بہ آب از آتش می دادہ ام خاکِ مصلیٰ را
بباد از نالۂ نے بردہ ام ناموسِ تقویٰ را

یہ جانتا ہوں کہ تو اور جوابِ نامۂ شوق
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب

یہ جانتا ہوں کہ تو اور جواب نامۂ شوق، اس مصرع میں یہ اصلاح کی کہ ع یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب۔ اصلاح کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک اضافت کم ہو گئی۔

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گل مت دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا
غمِ فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو

"تکلیف سیرِ گل مت دو"۔ اسے نکال کر یوں بنا دیا۔ "تکلیف سیر باغ نہ دو۔" شاید مت کا لفظ نکالنا مقصود تھا۔ گو یہ لفظ اس زمانہ میں عموماً زبان پر تھا مگر اہلِ لکھنؤ ترک کر چکے تھے اور غالب کو اس بات کا بہت خیال تھا۔

نہ پائی وسعتِ جولان یک جنوں ہم نے
عدم کو لے گئے دل میں غبار صحرا کا
ملی نہ وسعتِ جولان یک جنوں ہم کو

"نہ پائی وسعت جولان یک جنوں ہم نے"۔ اس مصرعے کی نظرثانی میں مصرعے کو یوں بدل دیا ع ملی نہ وسعت جولان یک جنوں ہم کو۔ لیکن جولان یک جنوں صاف لفظ نہ تھا۔ نظر انتخاب میں یہ شعر پورا نہ اترا۔ دیوان سے نکال ڈالا۔ مطلب یہ ہے کہ ایک مرتبہ کے جنون میں

بھی صحرا میں وسعت جولاں ہم کو نہ ملی۔ صحرا کی طرف سے یہ غبار ہمارے دل میں رہ گیا۔

صفحہ ۱۵

اب میں ہوں اور خون دو عالم معاملہ
ٹوٹا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو

"اب میں ہوں اور خون دو عالم معاملہ"۔ اس مصرعہ میں "خون دو عالم معاملہ"۔ عجب طرح کی ترکیب ہے جس کی غرابت و ثقالت واضح ہے۔ پہلی نظر میں یہی غرابت تازگی معلوم ہوئی۔ فکرِ شعر کے وقت یہی حال ہوتا ہے۔ لیکن دوبارہ جب نظر پڑی تو اُسے اس طرح بدل دیا۔

"اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو"۔ یعنے آئینہ کے ٹوٹنے سے ہزاروں آرزوں کا خون ہو گیا۔ اور میں اُن کا ماتم دار ہوں"

موجِ سراب دشت وفا کا بیاں نہ پوچھ
ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آبدار تھا
موجِ سراب دشت وفا کا نہ پوچھ حال

اس مصرعہ میں (بیاں نہ پوچھ) خلاف محاورہ تھا۔ پہلے اس پر نظر نہ پڑی۔ جب نظرِ ثانی کا موقع ہوا تو اس طرح اصلاح کی۔

ع موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال۔

صفحہ ۱۶

مجھے اس قطع رہ میں خوف گمراہی نہیں غالب

عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا
مجھے راہِ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب

یعنے "جس راہ کو میں قطع کر رہا ہوں اس میں گمراہی کا خوف مجھے نہیں کہ بیدل کا قلم اس راہ میں عصائے خضر ؑ ہے۔ وہ میری ہدایت کرے گا۔" نظرِ ثانی میں شاید یہ خیال آیا کہ اس قطع رہ میں ابہام ہے صاف صاف کیوں نہ کہو۔
ع مجھے راہِ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب۔ مگر اب سخن کا لفظ بیت میں مکرر ہوگیا۔

صفحہ ۱۷

قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے

ہاں اس معاملہ میں تو میرا قصور تھا
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

پہلے دوسرا مصرعہ یہ تھا ع ہاں اس معاملہ میں تو میرا قصور تھا۔ پھر یوں اصلاح کی ع اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا۔ اصلاح کا لطف یہ ہے کہ اس مقام پر ایسے ہی لفظ کہے جاتے ہیں۔ اور اسی طرح سے ادا کئے جاتے ہیں۔ کلام حسبِ مقتضائے مقام ہو تو اس کا کیا پوچھنا۔

صفحہ ۱۹

جاں درہوائے یک نفسِ گرم ہے اسدؔ
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا
جاں درہوائے یک نگہِ گرم ہے اسدؔ

"جاں در ہوائے یک نفسِ گرم ہے اسد" نفس سے کس کا نفس مراد ہے۔ یہ بات مبہم تھی نفس کی جگہ نگہ بنا دیا۔ مطلب صاف ہو گیا۔ یعنے "تیری ایک نگاہ گرم میں پروانہ کی طرح میں جل جاؤں گا۔ یہی میری آرزو ہے۔"

صفحہ ۲۰

بے خونِ دل ہے چشمِ جنوں میں نگہ غبار
یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا
بے خون دل ہے چشم میں موج نگہ غبار

"بے خون دل ہے چشم میں موج نگہ غبار"۔ چشم جنوں کا لفظ تو لکھ گئے مگر نظرِ ثانی میں چشم کی اضافت جنون کی طرح غریب معلوم ہوئی اصلاح کیا خوب ہے۔ "بے خون دل ہے چشم میں موج نگہ غبار"۔

باغ شگفتہ تیرا۔ بساطِ ہوائے دل
ابرِ بہار۔ خمکدہ۔ کس کے دماغ کا
باغ شگفتہ تیرا۔ بساطِ نشاطِ دل

"باغ شگفتہ تیرا بساط ہوائے دل۔" اس مصرعے میں بساط ہوائے دل کو بساطِ نشاطِ دل محض تجنیسِ خطی کے لحاظ سے بنا دیا ہے ورنہ بساط ہوائے دل میں کوئی قباحت نہ تھی۔

صفحہ ۲۱

گر نہ احوال شب فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغ مہ مہر دہاں ہو جائے گا

"گر نہ اندوہ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا" اس مصرعے میں لفظ

احوال مبہم تھا۔ شادی و غم، درد و راحت و خواب و بیداری و غشی سب کو احوال کہہ سکتے ہیں۔ نظرِ ثانی میں اندوہ کا لفظ بنایا جس سے مطلب صاف ہو گیا۔ ہر کاتب و شاعر کو اس سے سبق لینا چاہیئے۔

لے تو لوں سوتے میں اس کے بوسہ ہائے پا مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا
لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر

"لے تو لوں سوتے میں اس کے بوسہ ہائے پا مگر" مصنف کے حدوثت سن کا یہ کلام ہے۔ اس زمانے میں ان کی یہی رائے تھی کہ جس قدر فارسی آمیزش ہو غزل کے لیے بہتر ہے لیکن نظرِ ثانی میں رائے بدل گئی۔ بوسہ ہائے پا کو کاٹ کر پاؤں کا بوسہ بنا دیا۔

صفحہ ۲۲

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط
شعلہ خس میں۔ جیسے خوں در رگ نہاں ہو جائے گا
شعلہ خس میں۔ جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

"شعلہ خس میں۔ جیسے خوں در رگ نہاں ہو جائے گا" دَر اور بَر کا استعمال اس طرح اردو میں ناجائز ہے۔ آخر در رگ کی جگہ (رگ میں) بنانا پڑا۔

زہد گردیدن ہے گرد خانہ ہائے منعماں
دانۂ تسبیح سے میں مہرہ در ششدر ہوا
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

"زہد گردیدن . . . . الخ۔ یعنے منعموں کے دروازوں کے گرد پھرتے رہنے کا نام زہد ہے۔ مَیں نے زہد اختیار کیا اور تسبیح ہاتھ میں لی تو اس کا انجام یہ ہُوا کہ مَیں مہرہ در ششدر رہوں۔ مہرہ در ششدر اس شاطر کو کہتے ہیں جس کا مہرہ ششدر میں آجائے۔ ششدر وہ مقام ہے جہاں مہرہ کسی صورت سے بچ ہی نہ سکے۔ شاطر کے لیے یہ بڑی شکست ہے۔ مصنف نے نظرِ ثانی میں شاید گردیدن کے لفظ کو ناپسند کر کے شعر کو نکال ڈالا۔ اس کے بعد حاشیہ پر یہ شعر لکھ دیا ع اعتبار عشق کی . . . . . . الخ۔

پہلا شعر نو مشقی کا نمونہ ہے۔ دوسرا پختگی کا اول ہیا آورد ہے اس میں آمد۔ یہ شعر دیوان کی نظرِ ثانی میں قلم سے ٹپک پڑا۔

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ بادہ یکسر رشتۂ گوہر ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

جامِ بادہ کو جامِ مے بنانے سے کوئی معنوی خوبی نہیں پیدا ہوئی ہے۔ ہاں یکسر کی جگہ سراسر کے لفظ نے معنیٰ کے قالب میں جان ڈال دی۔

صفحہ ۲۳

اُف نہ کی۔ گو سوزِ دل سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا
دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا

گو اور گویا خاموش کے ساتھ ایہام تناسب رکھتے ہیں۔ جس زمانے میں یہ مطلع کہا تھا۔ ضلع کو بُرا نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ عمداً

لفظ گو کہ بہ تکلف داخل کیا ہے۔ نظرِ ثانی میں مصنف کو یہ تکلف تبذل معلوم ہُوا۔ اور مصرعہ کو بدل دیا۔ ع دل میرا . . . . . . الخ

تا کجا افسوس گرمی ہائے صحبت اے خیال

دل زِ آتش خیزیِ داغِ تمنّا جل گیا

دل زِ سوزِ آتشِ داغِ تمنّا جل گیا

آتش خیزی میں ایسا وضوح نہیں ہے جیسا سوزِ آتش میں ہے۔ گو اب ایک اضافت بڑھ گئی مگر آتش خیزی سے زیادہ وضوح اس میں معانی کا ہے۔ لیکن اُردو میں اس طرح زِ کا استعمال نامقبول ہے آخر انتخاب دیوان کے وقت شعر کو نکال ہی ڈالا۔

صفحہ ۲۴

آہ وہ جرأت فریاد کہاں

دل کے پردے میں جگر یاد آیا

دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

"دل کے پردے میں جگر یاد آیا"۔ مطلب یہ ہے کہ شکایت دل سے یہ تھی کہ تجھ میں فریاد کی جرأت نہیں۔ یہ جرأت پھر کس میں تھی؟ اگر تھی تو جگر میں تھی۔ یعنے جگر کے یاد آنے کی یہ ترتیب تھی کہ پہلے دل سے خطاب کیا اس خطاب سے ذہن جگر کی طرف آیا۔ گویا اس کے اور جگر کے درمیان پردے کی طرح دل حائل تھا۔ یہ معنیٰ ہیں دل کے پردے میں جگر کے یاد آنے کے۔ اس میں ضلع کا لفظ پردہ ہے۔ کہ دل میں بھی پردہ ہوتا ہے۔ اس طرح کے ضلع بولنے میں معنیٰ اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ یعنے سُننے والے کو پردہ کا لفظ سُن کر دو طرح

کے احتمال پیدا ہوتے ہیں۔ نظرِ ثانی میں مصنف نے اس اُلجھن کو دُور کر دیا۔ اب مصرعہ بالکل صاف ہو گیا۔

ع دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا۔

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال   دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

یہ وہ شعر ہے کہ دیوان صاف ہونے کے بعد نظر ثانی کرنے میں مصنف کے قلم سے ٹپک پڑا۔ اس کی برجستگی کہہ رہی ہے کہ سہو کاتب سے چھُوٹ نہیں گیا تھا۔ دفعتہً یہ شعر خیال میں آ گیا۔ اور فوراً حاشیہ پر لکھ دیا۔

تو دوست کسو کا بھی ستمگر نہ ہُوا تھا

اور وں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہُوا تھا

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا

قلمی نسخہ میں کسو کا لفظ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ غالب نے جب یہ مطلع کہا تھا۔ اس کی زبان پر کسو تھا۔ جب دیوان چھپنے لگا تو کسو کی جگہ کسی بنا دیا۔ یعنے اتنے دنوں میں زبان بدل گئی۔

صفحہ ۲۵

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا

جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا اسد مگر

اندازِ نالہ یاد ہیں سب مجھ کو پر اسد

اپنے اس مصرعہ پر "جس دل پہ . . . الخ" غالب نے تین طرح سے

مصرع لگائے ہیں (۱) عرضِ نیاز۔ ۔ ۔ الخ یعنے نیازمندی کیا سمجھ کر ظاہر کروں دل تو بے وفائی کے سبب سے پھٹ گیا۔ (۲) بیدادِ عشق ۔ ۔ ۔ الخ۔ یعنے جب دل نہیں رہا تو بیداد کون اُٹھائے گا۔ یہ مطلع اور مقطع دونوں منتخب دیوان میں موجود ہیں۔ (۳) نسخۂ حمیدیہ میں ایک مصرعہ اس طرح سے ہے "اندازِ نالہ۔ ۔ ۔ الخ یعنے مجھے اس طرح بھی نالہ کرنا آتا ہے کہ دل کے ٹکڑے اُڑ جائیں مگر اب وہ دل نہیں رہا۔

صفحہ ۲۷

شب کو وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
شمع سے یک خار در پیراہنِ فانوس تھا
رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

شمع سے۔ ۔ ۔ الخ۔ پہلی فکر کا نمونہ ہے۔ جس زمانہ میں یک اور در مصنف کو اُردو میں کہنا بُرا معلوم نہ ہوتا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی زمانہ میں متنبہ ہو گئے مصرعہ کو بدل دیا۔ "رشتۂ ہر شمع" ۔ ۔ ۔ الخ۔ مضمون لڑ گیا ہے۔ معز فطرت۔

خار پیراہن فانوس شود رشتۂ شمع
جا بہر بزم کہ آں آتش سوزاں دارد

غنچہ خاطر نے رنگ حمد گلستاں گل کیا
گردۂ تصویرِ گلشن بیضۂ طاؤس تھا
طبع کے واشد نے رنگ یک گلستاں گل کیا
یہ دلِ وابستہ گویا بیضۂ طاؤس تھا

غنچۂ خاطر نے . . . الخ۔ یعنی ایک غنچۂ خاطر نے سو باغوں کا رنگ دکھایا یہ تصویر باغ کا خاکہ بیضۂ طاؤس نکلا۔ بیضہ میں زردی اور سفیدی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مگر اس سے ایسا طائر پیدا ہوتا ہے۔ جس میں رنگا رنگ کے نقش و نگار ہوتے ہیں۔ گل کردن بیدل کے روز مرہ میں داخل ہے۔ مصنف نے اس کا ترجمہ کر لیا۔ اردو میں گل کرنا شمع کے بجھانے کو کہتے ہیں۔ اس التباس سے معنی الجھ کر رہ گئے۔ نظر ثانی میں اس مصرعہ کو اس طرح بدل دیا کہ طبع کی واشد نے . . . الخ۔ گل کرنے سے جو الجھن پیدا ہوئی تھی باقی رہ گئی۔ آخر شعر کو نکال ڈالا۔

پوچھ مت بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خون دل بے منت کیموس تھا

کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں

پوچھ مت . . . الخ۔ اس میں سے مت کا لفظ ترک کر کے یوں بنایا۔ کیا کہوں . . . الخ۔ اب بھی یہ شعر کاٹ دینے کے قابل تھا مگر مصنف کا قلم نہ اٹھا۔ اس وجہ سے کہ ایک علمی اصطلاح اس میں آ گئی تھی۔

صفحہ ۲۹

دمیدن کے نکیں جوں ریشۂ زیر زمیں پایا
بگرد سرمہ انداز نگاہ شرمگیں پایا

کاتب کی غلطی سے دوسرا مصرعہ ناموزوں ہو گیا۔ گرد سرمہ کو گرد سرمہ اس نے لکھ دیا۔ مطلب یہ ہے کہ نگاہ شرمگیں سرمہ کی گرد میں ریشۂ

زیرِ زمین کا اندازہ رکھتی ہے۔ جو کہ اب اُگا چاہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نگاہ اب گردِ سرمہ سے باہر نکلنے ہی کو ہے۔ تشبیہ نہایت خوب تھی۔ لیکن فارسیت ایسی بے موقع تھی۔ کہ اس مطلع کو آخر انتخاب نے نظری کر دیا۔

صفحہ ۳۱

مفتی نور الحق صاحب نے نسخہ حمیدیہ کی ترتیب صہ ۳۱ پر مصنف کے ۳ شعر اُردو کے اور حاشیہ میں تین شعر فارسی کے لکھے ہیں۔ واقع میں قابلِ دید ہیں۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اُردو کے شعر کس آسانی سے فارسی ہو گئے۔ اس سے یہ نکتہ حاصل ہوتا ہے کہ شعر میں مقدم زبان ہے۔ مضمون کیسا ہی عمدہ ہو۔ اگر زبان غلط ہے تو وہ شعر کاٹ دینے کے قابل ہے۔

اُردو

بہ شغل انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شبہا
سرِ تارِ نظر ہے رشتۂ تسبیح کوکب ہا
کرے گر فکر تعمیرِ خرابی ہاے دلِ گردوں
نہ نکلے خشت مثلِ استخواں بیرونِ قالب ہا
کرے ہے حسن خوباں پردہ میں مشاطگی اپنی
کہ ہے تہ بندیِ خطِ سبزہ خط در تہ لب ہا

فارسی

بہ شغل انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شبہا
سرِ تارِ نظر شد رشتۂ تسبیح کوکب ہا

کند گر فکرِ تعمیرِ خرابی ہائے ما گردوں
نیاید خشت مثلِ استخواں بیروں ز قالب ہا
ندارد حسن در ہر حال از مشاطگی غفلت
بود تہ بندیِ خط سبزۂ خط در تہ لب ہا

صفحہ ۳۲

یاد روزے کہ نفس در گرہ یارب تھا
نالۂ دل بہ کمر دامنِ قطعِ شب تھا
یاد روزے کہ نفس سلسلۂ یارب تھا

یاد روزے کہ نفس در گرہ . . . الخ۔ "در گرہ" کا لفظ یقیناً کاتب کی غلطی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ع "یاد روزے کہ نفس در گرو یارب تھا" یہ محاورہ کا لفظ ہے۔ یعنے نفس رہن یارب تھا۔ ہر وقت یارب یارب کہنے میں مشغول تھا۔ یارب محاورہ میں محض دعا کے معنیٰ پر مستعمل ہے۔ دوسرے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ نالہ قطعِ شب کے دامن سے کمر باندھے ہوئے تھا۔ یعنے اس بات پر آمادہ تھا۔ کہ تمام رات نالہ کشی میں کاٹ دے۔ اس میں "در" کا لفظ اردو کی بول چال میں داخل کرنا برا معلوم ہے۔ "در گرہ" کی جگہ سلسلہ کو لفظ نظر ثانی میں بنا دیا یعنے نفس گیا تھا یارب یارب کا ایک سلسلہ تھا۔ اس اصلاح میں "در" تو نکل گیا۔ لیکن دوسرے مصرعہ میں "بہ کمر" رہ گیا۔ یعنے "نالہ دامن شب بہ کمر تھا" یہ بھی اردو میں بدنما تھا۔ آخر انتخاب میں نہ آیا۔

باب ابرام نہ تھا دل ہی ہمارا غالب
ورنہ جو چاہیئے اسباب تمنا سب تھا

عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا

یعنی اصرار وکد کو ہم ہی نے مناسب نہ سمجھا۔ باب ابرام اس میں فارسی کا ایسا محاورہ ہے جو اُردو سے میل نہیں کھاتا۔ اصلاح یوں کی۔ عشق میں . . . الخ۔ اصلاح کے بعد بھی یہ شعر انتخاب میں نہ آیا۔

صفحہ ۳۴

انتظار زلف میں شمشاد ہمدست چنار
نقش بندِ شکلِ مژگاں از نمود شانہ تھا

انتظارِ جلوۂ کاکل ہیں ہر شمشادِ باغ
صورت مژگان عاشق صرف عرض شانہ تھا

انتظار زلف . . . . الخ اس بیت میں بہت کچھ اُلجھن ہو گئی تھی۔ چوب شمشاد سے شانہ بنتا ہے۔ اور صنوبر کے پھل کو بھی کنگھی کہتے ہیں۔ مصنف کا مطلب یہ ہے کہ شمشاد اپنے شانہ سے مژگاں کی شکل بنا کر چنار کی طرح زلف کے انتظار میں تھا۔ چنار کے پتے ہاتھ سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اسی سبب سے ہمدستِ چنار کہا ہے۔ اس قدر اُلجھن نظرِ ثانی میں محسوس ہوئی۔ کہ شعر کو اس طرح بدل دیا۔

انتظارِ جلوۂ کاکل . . . الخ۔ شمشاد صرف عرض شانہ تھا۔ یعنی اس بات کے عرض کرنے میں مصروف تھا۔ کہ شانہ میرے

پاس موجود ہے۔ میں پیش کرتا ہوں۔ غرض اب بھی شعر بے لطف رہا۔ نکال ڈالا گیا۔

جوشِ بے کیفیتی ہے اضطراب آرا اسد

ورنہ بسمل کا طپیدن لغزشِ مستانہ تھا

ورنہ بسمل کا تڑپنا لغزشِ مستانہ تھا

یعنے نشۂ عشق نہ ہونے کے سبب سے بسمل کو اس قدر اضطراب ہوتا ہے۔ ورنہ طپیدن بسمل ایک لغزشِ مستانہ تھا۔ اور کچھ نہیں۔ یہاں اضطراب انگیز کو عام لفظ سمجھ کر حیرت کی ہے۔ اضطراب آرا سے مراد اضطراب انگیز ہے۔ ابتدائے مشق میں مصنف کو طپیدن کا لفظ اُردو میں بُرا معلوم نہ ہُوا۔ اُن کے کلام منتخب میں بھی سوختن و شنیدن و فسردن وغیرہ موجود ہے۔ لیکن نظر ثانی میں اس مقطع سے طپیدن کا لفظ کاٹ کر تڑپنا بنا دیا۔ لیکن اضطراب آرا کو کاٹ کر اضطراب انگیز نہ بنایا۔ غرض ایک ایسا خلاف محاورہ لفظ اس بیت میں باقی رہ گیا تھا۔ کہ انتخاب کے وقت اس پر نظر پڑی۔ سارا شعر ہی دیوان سے مصنف نے تو نکال ڈالا۔ لیکن کسی سخن شناس کے دل سے نہیں نکل سکتا۔ لوگ اس شعر کو اس طرح یاد رکھیں گے۔

ؔ جوش بے کیفیتی ہے اضطراب انگیز اسد

ورنہ بسمل کا تڑپنا لغزشِ مستانہ تھا

صفحہ ۳۸

اسد طرز آشنایاں قدر دانِ نکتہ سنجی ہیں

سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاق تحسیں کا

اسد ارباب فطرت قدر دانِ لفظ و معنی ہیں

یہ ظاہر ہے کہ طرز آشنایاں بے اضافت کے اُردو میں خلافِ محاورہ ہے ۔ اس وجہ سے لفظ کو بدل دیا ۔ فطرت وہ لوگ جن کا ذوق سخن فطری ہے ۔

صفحہ ۴۰

یہ مہر نامہ جو بوسہ گل پیام رہا
ہمارا کام ہُوا اور تمھارا نام ہُوا
ہمارا کام ہوا اور تمھارا نام رہا

"نام ہُوا" کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے ۔ اصل لفظ "نام رہا" ہے مطلب یہ ہے کہ نامہ پر جو تمھارے نام کی مہر ہے ۔ یہ بوسہ بہ پیغام ہے ۔ مہر کی تشبیہہ گل کے ساتھ دینا بھی مقصود ہے ۔

صفحہ ۵۲

حیرتِ حسنِ چمن پیرا سے تیرے رنگِ گل
بسمل آہنگ پریدن ہے بہ بالِ عندلیب
بسملِ ذوقِ پریدن ہے بہ بالِ عندلیب

تیرے حسنِ چمن پیرا سے حیرت میں آ کر گل کے چہرے کا رنگ بلبل کے پر لگا کر اُڑ جانے کا مقدور رکھتا ہے ۔ بسمل آہنگ یعنے اپنے آہنگ کے پورا کرنے میں بے تاب و بے قرار ہیچ مداں کے مذاق میں بسمل آہنگ ایسی غلط ترکیب نہ تھی کہ اس پر اصلاح کی جاتی ۔ لیکن نظرِ ثانی میں مصنف نے بسمل آہنگ پریدن کو کاٹ کر بسملِ ذوقِ پریدن بنا دیا ۔ اس میں شک نہیں ۔ اب معنے واضح تر ہو گئے ۔ شوکت بخاری سے

شہید تیغ او را ضعف بند دست و پا باشد

بہ بالِ جوہرِ شمشیر پرواز است رنگش را

غالباً اسی توارد نے شعر کو انتخاب میں نہ آنے دیا۔

صفحہ ۵۳

ہے مگر موقوف بر وقت دگر کار اسد

اے شبِ پروانہ و صبحِ وصالِ عندلیب

اے شبِ پروانہ و روزِ وصالِ عندلیب

"شبِ پروانہ و صبحِ وصالِ عندلیب"۔ ایک بیت میں منظوم کر کے مصنف کو یہ خیال پیدا ہوا کہ صنعت طباق کا مقتضیٰ یہ ہے کہ صبح کے ساتھ شام کا ذکر کیا جاتا۔ مگر وزنِ شعر اس کے منافی ہے۔ یا شب کے ساتھ روز کا ذکر کیا جائے اور یہ تغیر آسانی سے ہو سکتا تھا۔ غرض صبح کا لفظ کاٹ کر اس کی جگہ روز کا لفظ لکھ دیا۔

صفحہ ۵۶

نیم رنگی جلوہ ہے بزمِ تجلی زار دوست

دودِ شمع کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست

اس مطلع میں بڑا سقم "نیم رنگی جلوہ" ہے۔ یہی وجہ اصلاح کی ہوئی۔

ع آمدِ خط سے ہوا ہے . . . . الخ۔ اب مطلب واضح ہو گیا۔

صفحہ ۵۵

ہر غنچۂ گل صورتِ یک قطرۂ خوں ہے

خوباں کا جو دیکھا ہے حنا بستہ سرِ انگشت

دیکھا ہے کسی کا جو حنا بستہ سر انگشت

اصلاح کی وجہ یہ ہے کہ بلا اضافت خوبیاں کہنا اردو میں درست نہیں ہے۔

صفحہ ۵۷

نہیں گر۔ سر و برگِ سودائے معنیٰ
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

نہیں گر۔ سر و برگِ ادراکِ معنیٰ

سودا یہاں مقتضائے مقام کے خلاف تھا۔ اس کی جگہ ادراک کا لفظ نہایت مناسب اصلاح ہے۔

صفحہ ۵۹

طبع نالاں حاملِ صد غلبۂ تاثیر ہے
دل کو اے عاشق کشاں تعلیم خارائی عبث

طبع عاشق حاملِ صد غلبۂ تاثیر ہے
دل کو اے بیداد خو تعلیم خارائی عبث

اے عاشق کشو! تم اپنے دل کو عبث پتھر بناتے ہو۔ طبع نالاں حاملِ صد غلبۂ تاثیر ہے۔ یعنے سو طرح سے تمھارے دل پر تاثیر کر سکتی ہے۔ اصلاح میں عاشق کشاں کی جگہ بیداد خو بنا دیا اور طبع نالاں کو طبع عاشق کر دیا۔ مگر جس لفظ سے معنی میں اُلجھن پڑ گئی وہ حاملِ صد غلبۂ تاثیر ہے۔ شعر کے انتخاب میں نہ آنے کا بڑا سبب یہی ہے۔

صفحہ ۶۱

گلشن میں بند و بست بہ ضبط دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج

ضبط کا لفظ کئی معنی رکھتا ہے جس سے اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔ نظرِ ثانی میں ضبط کی جگہ رنگ کا لفظ بنا دیا۔ اس سے رعایت بھی پیدا ہو گئی۔

اے عافیت کنارہ کر۔ اے انتظام چل

سیلاب گریہ دشمنِ دیوار و در ہے آج

سیلاب گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

اس بیت میں دشمن کو کاٹ کر مصنف نے لفظ درپے محاورہ کے لحاظ سے بنایا ہے۔ یعنے سیلاب آج دشمن ہے اور سیلاب آج درپے ہے۔ ان دونوں صورتوں میں آج کے ساتھ درپے کا لفظ زیادہ مربوط ہے۔

بے تابی نے کیا سفرِ سوختن تمام

پیراہنِ خسک میں غبارِ شرر ہے آج

کرتی ہے عاجزی سفرِ سوختن تمام

خار و خسک میں جب آگ لگتی ہے تو بہت جلد جل اُٹھتے ہیں۔ گویا بے تابی کے ساتھ راہِ سوختن کے طے کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اور شرار جب بجھتا ہے۔ تو خاکستر ہو جاتا ہے۔ شاعر اپنے تن زار کو خار و خسک سے استعارہ کرتا ہے۔ یعنے آتشِ عشق نے پھونک دیا۔ اب خار و خسک کی خاکستر باقی رہ گئی ہے۔ پھر نظرِ ثانی میں اس طرح تصرف کیا گرتی ہے۔ . . . الخ۔ مصنف کو خار و خسک کی عاجزی یاد آ گئی۔ بیتابی کی (ی) کا گرنا بھی برا معلوم ہوا تصرف کیا اور کچھ نہیں کیا۔ آخر انتخاب کے وقت اس بیت کو نکال ہی ڈالا۔

صفحہ ۶۳

کمالِ گرمیٔ سعیِ تلاشِ جلوہ نہ پوچھ
برنگِ خار میرے آئینہ سے جوہر کھینچ
کمالِ گرمیٔ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ
یعنے میں وہ آئینہ ہوں جس میں جوہر نہیں بلکہ کانٹے تلاشِ دید میں چبھے ہیں۔

صفحہ ۶۶

(اُردو) تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد
(فارسی) نگہم نقب ہمی زد بہ نہاں خانۂ دل
مژدہ باد اہلِ ریا را کہ زمیداں رفتم
میرے مرنے سے یا غیبت سے وہ لوگ بے خطر ہو گئے۔ اس میں لفظ نقاب اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ جس زمانہ میں یہ شعر کہا ہے مصنف کو اس کا ثقل نہ محسوس ہوا۔ شعر کا مضمون بھی کوئی دلکش نہ تھا۔ مگر مصنف نے بہ سبب ثقل کے اُردو دیوان سے کاٹ کر فارسی کے دیوان میں اس طرح رکھ لیا۔ ع نگہم نقب . . . . الخ۔

صفحہ ۶۹

جواب سنگ دلی ہائے دشمناں ہمت
ز دستِ شیشگیٔ طبع دوستاں فریاد
ز دستِ شیشۂ دلہائے دوستاں فریاد
ز دستِ شیشہ دلی ہائے دوستاں فریاد
دشمنوں کی سنگدلی سے دوستوں کی دل شکنی کیوں ہو۔ پتھر کے جواب

میں شیشہ کی طرح ٹوٹ کر فریاد کرنا بے ہمتی ہے۔ اس بیت میں شیشگیٔ طبع کا لفظ اچھا نہیں۔ ایک تو شیشہ سے شیشگی کا اشتقاق دوسرے شیشگیٔ طبع بھی نامقبول۔ دل کو شیشہ کہتے ہیں اور طبع کو شیشہ کہنا نئی بات ہے۔ انھیں وجوہ سے مصنف نے مصرعہ شاید اس طرح بنا دیا۔ ؏ زِ دست شیشۂ دلہاے.... الخ یعنے فریاد ہے کہ لوگ سنگ دلی کے مقابل میں شیشہ دلی دکھاتے ہیں۔ مگر اس مصرعہ پر بھی مجھے سہو کاتب کا شبہ ہے۔ غالباً مصنف نے "سنگدلی ہائے دشمناں"۔ کے مقابل میں "شیشہ دلی ہائے دوستاں" کہا ہوگا۔ اُسے کاتب نے "شیشہ دلہاے دوستاں" لکھ دیا۔ اس سے صنعتِ طباق کا حسن کم ہوگیا۔

صفحہ ۷

بلا سے ہیں جو بہ پیش نظر در و دیوار
نگاہ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار
بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار

مصنف کی فارسیت اس طرف مُنجر ہوئی کہ پیش نظر کی جگہ بہ پیش نظر کہے۔ لیکن نظرِ ثانی میں (بہ) کو (یہ) بنا دیا۔ یعنے اس بات کا سبق دیا کہ بہ کا لانا بھی اُردو میں بُرا معلوم ہوتا ہے۔

جنونِ اشک نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے میرے دیوار و در در و دیوار
وفور اشک نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ

اس سنگلاخ زمین میں اس پختہ کاری و شان مشق کو دیکھے جو

دوسرے مصرعہ سے ظاہر ہوتی ہے کہ جہاں دیوار تھی وہ سیلِ اشک سے گر کر در ہوگئی۔ اور جہاں در تھا وہاں منہدم ہوجانے کے سبب سے دیوار پیدا ہوگئی۔ اس طرح دیوار و در در و دیوار ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی ابتدائی مشق کی خامی بھی (جنوں اشک) کے لفظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ نظر ثانی میں اُس کو (وفور اشک) بنا دیا۔ کوئی اور کہتا تو وفورِ گریہ کہتا۔

کیا ہے تو نے مئی جلوہ کس قدر ارزاں

کہ مست ہے ترے کوچہ میں ہر در و دیوار

ہوئی ہے کس قدر ارزانیٔ مئے جلوہ

مَی کو مذکر باندھ گئے تھے۔ جلوہ کی تذکیر نے دھوکا دیا تھا۔ اصلاح میں یہ سقم دور ہوگیا۔ ع "ہوئی ہے کس قدر ارزانیٔ مئے جلوہ"

صفحہ ۱۱

نہیں بند زلیخا بے تکلف ماہ کنعاں پر

سفیدی دیدۂ یعقوبؑ کی پھرتی ہے زنداں پر

نہ چھوڑی حضرت یوسفؑ نے یاں بھی خانہ آرائی

یعنے زلیخا نے حضرت یوسفؑ کو قید بھی کیا ہے تو اُس میں تکلف اور آرائش پائی جاتی ہے۔ لیکن "بند زلیخا" اور "بے تکلف" دونوں لفظ مفہوم پر صاف صاف دلالت نہیں کرتے۔ آخر اصلاح یہ ہوئی۔

ع نہ چھوڑی حضرت ۔ ۔ ۔ ۔ الخ۔

اسد اے بے تحمل عربدہ بیجا ہے ناصح سے

کہ آخر بے کسوں کا زور چلتا ہے گریباں پر

نہ لڑتا ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

اسد اے . . . . الخ۔ پہلے غزل کا مقطع بھی تھا اور تصنیف کے وقت مصنف کا طرز بیان بھی یہی تھا۔ نظرِ ثانی میں اس مقطع کی کیا خوب اصلاح کی ہے۔ نہ لڑ ناصح سے غالب . . . . الخ۔

صفحہ ۷۳

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشق ناز کر۔ خونِ تمنا۔ میری گردن پر
کہ مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

اس مقطع کی اصلاح یعنے تمنا کی جگہ دو عالم کا لفظ ایک نگینہ ہے۔ جس سے شعر کی خوبی ہزار درجہ بڑھ گئی۔ اور یہ بیت غالب کے کارناموں میں شمار کی گئی۔ یہ اصلاح عجب اصلاح ہے۔

صفحہ ۸۱

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سر بسر انداز
اے ترا جلوہ یک قلم انگیز

اُردو کے محاورے میں انگیز کرنا برداشت کرنے کے معنی میں بولتے ہیں۔ جلوہ کے ساتھ برداشت کرنا مقتضائے مقام کے خلاف پڑتا ہے کہ جلوہ تو ایک محبوب چیز ہے شاید پہلے جلوہ کہا تھا نظرِ ثانی میں غمزہ بنا دیا۔ چنانچہ متداول نسخے میں ایسا ہی ہے۔

یا علی ایک نگاہ سوئے اسد
میں غریب اور تو غریب نواز

نگہِ التفات سوئے اسد
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا

یا علی . . . . . الخ - یہ ایک معمولی سا شعر تھا - ان مضامین کو اکثر لوگ کہا کرتے ہیں - اس کے سوا کوئی سقم نہ تھا - مصنف نے نظرِ ثانی میں مصرعہ اس طرح بدل دیا - نگہِ التفات . . . . . الخ - اب بھی فعل کا محذوف ہونا محاورہ اردو کے خلاف تھا - پھر نظر پڑی تو مضمون ہی بدل دیا - شوخیٔ طبع نے مصرعہ لگانے کا اور ہی راستہ نکال لیا - ع مجھ کو پوچھا . . . . . الخ -

صفحہ ۸۶

کفر ہے غیر از گدازِ شوق رہبر خواستن
راہ صحرائے حرم میں ہے جرسِ ناقوس و بس

کفر ہے غیر از فورِ شوق رہبر خواستن

یعنے گدازِ شوق کے سوا کسی اور رہبر کی خواہش کرنا کفر ہے - کمالِ شوق و ہوائے شوق و فورِ شوق وغیرہ رہبری کر سکتے تھے - گدازِ شوق کے لیے کیا خصوصیت تھی - آخر مصنف نے اس طرح اصلاح کی -

ع کفر ہے غیر از . . . . . الخ - "رہبر خواستن" کا انقلاب بھی کھٹکتا ہے -

اے اسد گل تختۂ مشقِ شگفتن ہو گئے
غنچۂ خاطر رہا افسردگی مانوس و بس

یک جہان گل تختۂ مشقِ شگفتن ہو گئے

یعنے شگفتن نے گُل کو تختۂ مشق بنایا لیکن غنچۂ دل افسردگی مانوس ہی رہا۔ نظرِ ثانی میں یوں اصلاح کی ع یک جہان گل . . . الغرض اصلاح کے بعد بھی شگفتن و افسردگی مانوس کے لفظ ویسے زبان اُردو سے بیگانہ رہ گئے کہ انتخاب میں یہ شعر نہ آسکا۔ یک جہان گل نے اور بھی بے لطفی پیدا کردی تھی۔

صفحہ ۸۸

زجوش اعتدالِ فصل و تمکینِ بہار آتش
یہ اندازِ حنا ہے رونق دست چنار آتش
ہوئی ہے بسکہ صرفِ مشقِ تمکینِ بہار آتش

اس مطلع میں ایک ردیف ہی بیکار جاتی ہے۔ اس کے علاوہ "تمکین بہار" کا لفظ بھی محض برائے بیت معلوم ہوتا ہے۔ کاش تزئین بہار کہتے کہ دستِ چنار کی حنابندیٔ آتش سے ایک طرح کی تزئین ہے۔ یہ ابتدائے مشق کی خامی تھی نظرِ ثانی میں مصرعہ بدل دیا ع ہوئی ہے بسکہ . . . الخ اب ردیف تو بیکار نہیں جاتی۔ مگر لفظ تمکین اب بھی بیکار ہے۔ چنار کے پتے ہاتھ سے مشابہ ہیں۔ اور چنار میں بھی آگ لگ جاتی ہے۔ گویا آگ حنا کی طرح دست چنار کی تزئین کرتی ہے۔

فروغ حسن سے ہوتی ہے حل مشکل عاشق
نکالے ہے زپائے شمع برجا ماندہ خار آتش
نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

نہ پائے شمع آتش خار نکالے ہے۔ اس طرح کی اُردو رکیک سمجھی جاتی ہے۔ نظرِ ثانی میں اس مصرعہ کو یوں بدل دیا ع نہ نکلے شمع کے . . . . الخ۔

صفحہ ۹۰

غم اس کو حسرت پرواز کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع
غم اس کو حسرت پروانہ کا ہے اے شعلہ

شمع کو حسرت پرواز کا غم ہونا ایک بے معنی سی بات ہے۔ متداول نسخوں میں پرواز کی جگہ پروانہ ہے۔ زیادہ تر یہ شبہ ہوتا ہے کہ پروانہ اصلاح نہیں ہے۔ کاتب کا تصرف ہے۔ غالب کی طبیعت کا انداز یہی کہتا ہے کہ پرواز کا لفظ صحیح ہے۔ یعنے شعلہ کے لرزنے کو طائر کے پَر تولنے سے تشبیہ دی ہے۔ اور یہ تشبیہ متحرک بہ متحرک فکر غالب کی خصوصیات سے ہے۔

صفحہ ۹۱

۔ جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
اسدؔ ہے دل پہ مرے داغ بدگمانیٔ شمع
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغ بدگمانیٔ شمع

اس کی وجہ سمجھ میں نہ آئی کہ اس مقطع میں کیا قباحت تھی جو مصنف نے اسے بیت بنا دیا اور غزل بے مقطع رہ گئی۔ نظرِ ثانی میں دوسرے مصرعہ کو اس طرح بدل دیا۔ ع نہ کیوں ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ۔

صفحہ ۹۶

زخم پر باندھے ہیں کب طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک
زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک

نمک باندھنے سے نمک چھڑکنا بہتر اور محاورہ ہے۔ اس وجہ سے اس مصرعہ کو اس طرح بدل دیا۔ ع زخم پر چھڑکیں۔ . . . الخ۔

غیر کی منت نہ چھوڑوں گا پئے توفیر درد
زخم دل جوں خندۂ خوباں ہیں اترایا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیر درد
زخم مثل خندۂ قاتل ہے سرتاپا نمک

پہلے مصرعہ میں "منت نہ چھوڑوں گا" کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے اور دوسرے مصرعہ میں جوں کا لفظ ہے۔ جواب محاورہ میں متروک ہے اصلاح اس طرح ہوئی۔ ع غیر کی منت نہ کھینچوں گا . . . . الخ

صفحہ ۹۹

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار
مجھ سے حساب بے گنہی اے خدا نہ مانگ

مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

یعنے حسرت گناہ کے بے شمار داغ جو رکھتا ہو اس نے کوئی گناہ ہی نہیں کیا۔ اُس بے گناہ سے حساب کیا معنے سوا اس کے بتا کون کون سے گناہ تو نے نہیں کئے۔ لیکن اس طرح کی بازپرس میں داغ ہائے دل کا شمار یاد آتا ہے۔ اور جو حسرتیں دل میں تھیں وہ یاد آجاتی ہیں اتنے معنیٰ لفظ بے گنہی میں صاف نہیں نکلتے۔ سیدھی بات یہی ہے کہ ع مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ۔

صفحہ ۱۰۳

بے دلوں سے ہے تپش جوں خواہش آب از سراب
ہے شرر معلوم گر رکھتا نہ ہوے سنگدل
ہے شرر موہوم گر رکھتا نہ ہوے سنگدل

یعنے جو دل نہیں رکھتے ان میں تپش کجا۔ سراب سے خواہش آب کرنا کیا معنی۔ پتھر اگر دل نہ رکھتا تو اس میں شرر کا ہونا معلوم۔ اس بیت میں جوں ۔ از ۔ ہوے ۔ کے علاوہ ۔ ہے شرر معلوم بھی محاورہ سے الگ تھا۔ محاورہ یہ ہے کہ شرر کا ہونا معلوم یعنے شرر نہیں ہو سکتا۔ فقط اسی محاورہ کا خیال کر کے مصنف نے معلوم کی جگہ موہوم بنا دیا۔

صفحہ ۱۴۴

نقشبند چاک ہے موج از فروغ ماہتاب
سیل سے فرش کتان کرتے ہیں تا ویرانہ ہم
ہے فروغ ماہ سے ہر موج یک تصویر خاک

نسخۂ حمیدیہ میں نقشبند خاک اور تصویر خاک لکھا ہے۔ یہاں خاک کے کچھ معنے نہیں بنتے۔ میں اسے چاک پڑھتا ہوں۔ فروغ ماہ جس طرح کتان کو چاک چاک کر دیتا ہے۔ اسی طرح سیل کی ہر موج کو چاک کے مشابہ کر دیتا ہے۔ میرے ویرانے میں جو سیل آتی ہے وہ فروغ ماہ سے فرش کتان ہو گئی ہے۔ یعنے موجوں میں چاند کا عکس فرش کتان معلوم ہوتا ہے۔ اس بیت میں نقشبند چاک کا لفظ نہایت تکلف کا تھا۔ مصرعہ کو اس طرح بدل دیا۔ فروغ ماہ سے . . . . . الخ۔ موجیں خود چاک چاک ہیں جب ان میں چاند کا عکس پڑتا ہے تو عکس ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ فروغ ماہ کی قید سے شعر میں یہ ضعف پیدا ہو گیا

محض تشبیہ کے لیے فکرِ شاعر نے تراشا ہے کہ سیل میرے ویرانے میں آئی اور چاک کتان کی تصویریں پیدا ہو گئیں۔ شاید اسی تکلف اور تصنع کے سبب سے یہ شعر انتخاب میں نہ آیا۔

صفحہ ۱۰۵

شام غم میں سوزِ عشق شمع رویاں سے اسد
پر فشاں سوختن ہیں صورتِ پروانہ ہم
شام غم میں سوزِ عشق آتش رخسار سے

یعنے پروانہ کی طرح جل جانے کے شوق میں تڑپ رہے ہیں۔ اس زمین میں سے ایک اور مقطع مصنف کے ذہن میں آیا۔

؎ دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسد
جلنتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

اس مقطع کو حاشیہ دیوان پر لکھ دیا۔ تو یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک غزل میں دو مقطعوں کی کیا ضرورت ہے۔ پہلے جو مقطع کہا تھا اُسے بیت کر دیا جس مصرعہ میں تخلص تھا اُسے کسی قدر بدل دیا۔ ع شام غم میں سوزِ عشق آتشِ رخسار سے۔ اب اضافتوں کی تکرار ناگوار ہوئی اس سبب سے یہ بیت انتخاب میں نہ آئی۔

باوجودیک جہاں ہنگامہ پرموہوم ہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم
باوجودیک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں

پہلے مصرعہ میں (پر) سابے موقع خلاف محاورہ واقع ہوا تھا۔ نظرِ ثانی میں اصلاح کردی ع باوجودیک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں۔

صفحہ ۱۰۶

ضعف نے باندھا ہے پیمان گراں خوابی اسد
ہیں وبال تکیہ گاہ ہمت مردانہ ہم
ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترک جستجو

ہمارا ضعف ہمت مُردوں سے شرط بد کر سویا ہے۔ یعنے یہ گراں خوابی موت سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ گراں خوابی ہمت مردانہ کے لیے وبال ہے۔ اس زمین کے اشعار منتخب کرنے کے بعد مصنف کو وہی مقطع رکھنا مقصود تھا۔ جس میں تمناؤں کو زندان سینہ میں دائم الحبس کیا ہے۔ اس لحاظ سے تخلص اس بیت سے نکال ڈالا۔ ع ضعف سے ہے . . . . الخ۔ اس میں شک نہیں اب شعر بلند ہوگیا۔

صفحہ ۱۱۰

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی
شعر اسد کے ایک دو پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

یعنے ریختہ کا رشک فارسی ہونا بہت بڑا دعویٰ ہے۔ اُس کی دلیل میں ایک دو شعر پڑھنا کافی نہیں۔ گفتۂ غالب یعنے کلام غالب پڑھ کر سنا کہ دیکھ یہ ریختہ فارسی سے بہتر ہے۔

صفحہ ۱۰۸

لوں دام بخت خفتہ سے یک خواب خوش اسد
لیکن یہ بیم ہے کہ کہاں سے ادا کروں

یوں ہوا بختِ خفتہ سے یک خواب خوش ولے

غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

دیکھیے اُکس خوبی سے (اسد) کو نکال کر اُسی جگہ (ولے) بنا دیا۔ اب دوسرے مصرعہ میں لیکن کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن کی جگہ غالب بنا دیا۔ بیم کا لفظ بغیر ترکیب فارسی کے اُردو میں بُرا معلوم ہوتا ہے۔ لفظ خوف اُس کی جگہ رکھ دیا۔ اب یہ صورت پیدا ہوئی کہ خوف غالب ہے اور غالب یہ خوف ہے۔

صفحہ ۱۱۲

عزّت رفعت بنائے عالم امکان نہ ہو

اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

عزّت اوج بنائے عالم امکان نہ ہو

(رفعت بنائے عالم امکان) وحشی ترکیب تھی۔ لفظ رفعت کو اضافت دیتے تو وزن مانع ہوتا۔ اسی سبب سے رفعت کی جگہ اوج بنا دیا۔ اب صاف ہوگیا۔

صفحہ ۱۱۴

ریختہ میکا وہ ظہوری ہے بقولِ ناسخ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ

اس بندش میں یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ ناسخ کا یہ قول ہے کہ میر ریختہ کا ظہوری ہے۔ ناسخ کا یہ مقطع ہے ؎

شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی اُستادی میں

آپ بے بہرہ ہیں جو معتقد میر نہیں

غرض نظرِ ثانی میں مصنف نے صاف کر دیا ع غالب اپنا یہ... الخ

صفحہ ۱۱۵

دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا

بارے اپنے دردِ دل کی ہم نے پائی دادیاں

بارے اپنی بے کسی کی ہم نے پائی داد یاں

تنہا بیٹھنا بے کسی کی داد ہے نہ کہ دردِ دل کی۔ متداول نسخوں میں بے کسی کا لفظ ہے اور یہ اصلاح بہت خوب ہوئی ہے۔

صفحہ ۱۱۶

ہے مری وحشت عدوئے اعتبارِ جہاں

مہر گردوں ہے چراغ رہ گزارِ بادِ یاں

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام

یعنے میرے جوشِ وحشت کے آگے اعتبارات جہاں ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔ میری طبیعت اس سے وحشت اور گریز کرتی ہے۔ مطلب ادا ہوا مگر صاف صاف بات یہ ہے جو نظرِ ثانی میں قلم سے نکلی۔

ع ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام۔

دل نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالب

نہ کر بے باک اس کافر کو اُلفت آزمانے میں

نہ کر سرگرم اس کافر کو اُلفت آزمانے میں

جو بے باک ہو اس کے دل میں ترس کی یہی وجہ ہے کہ مصنف نے بے باک کی جگہ سرگرم بنا دیا۔ یعنے اگر وہ سرگرم امتحان ہوا اور تو نے جان دے دی تو اُس کا دل کڑھے گا۔

صفحہ ۱۱۷

ہوئی تقریب منع شوق دیدن خانہ ویرانی
کف سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں
ہوئی ہے مانع ذوقِ تماشا خانہ ویرانی

"تقریب منع شوقِ دیدن" میں ایک تو متواتر اضافتیں ہیں۔ جو اُردو میں کیا فارسی میں بھی بُری معلوم ہوتی ہیں۔ دوسرے فارسی کا مصدر دیدن بھی اُردو میں گراں گزرتا ہے۔ مصنف نے اس طرح اصلاح کی۔

ع ہوئی ہے مانع ذوق تماشا خانہ ویرانی۔

خانہ ویرانی ایسی ہوئی کہ دیواروں میں روزن پڑ گئے اور کف سیلاب نے روزن میں روئی بھر دی۔ غرض خانہ ویرانی مانع تماشا ہوئی۔ کف سیلاب کو پنبہ روزن سے تشبیہ دینے کے لیے یہ شعر کہا گیا ہے۔

صفحہ ۱۱۸

سادہ پُرکار ہیں خوباں کہ اسد
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں
سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ

"کہ اسد" کا ٹکڑا دوسرے مصرعہ سے ملا کر پڑھنا چاہیئے۔ کافِ بیان اپنے بیان سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اور غزل کا پہلا مصرعہ اس طرح کٹ جائے تو بُرا معلوم ہوتا ہے۔ البتہ نظم بے قافیہ میں یہ باتیں حسن رکھتی ہیں۔ محض اسی وجہ سے مصنف نے کافِ بیان کو آسانی سے نکال ڈالا۔ ع سادہ پُرکار ہیں . . . الخ۔ اس بیت میں اصلاح کا سبب ہرگز یہ نہیں ہے کہ مصنف نے چاہا کہ اسد کو نکال کر غالب رکھیں۔

صفحہ ۱۲۰

حیرت کش یک جلوۂ معنیٰ ہیں نگاہیں
کھینچوں ہوں سویداے دلِ چشم سے آہیں
مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

حیرت کش . . . . الخ اس مطلع میں یہ بات مبہم رہ گئی تھی کہ سویدائے دلِ چشم سے کیا مراد ہے۔ نظرِ ثانی میں اس طرح اصلاح کرکے انتخاب میں داخل کیا۔ ع مت مردمک . . . . الخ۔ یعنی سویدائے دلِ چشم بھی مردمک دیدہ ہے۔ اس مردمک میں نگاہیں نہ سمجھو۔ اس سویدا میں آہیں جمع ہوگئی ہیں۔

صفحہ ۱۲۷

ہوتے ہیں بے قدر در کنج وطن صاحبدلاں
عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں
ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت

در کا لفظ اور صاحبدلاں محاورہ اردو کے خلاف۔ مصرعہ اس طرح بدل دیا۔ ع ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت۔

صفحہ ۱۴۳

حسد پیمانہ سے دل عالم آب تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو
حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو

"حسد پیمانہ اور آب تماشا" عجب ترکیبیں ہیں جن سے مصنف کا مقصود

سمجھنا محال عادی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن عمداً کوئی مہمل نہیں کہتا۔ اس بات پر بھروسہ کر کے میں کچھ معنیٰ بیان کرتا ہوں۔ تنگ چشم حاسد جس کا دل پیمانۂ حسد سے بنا ہوا ہے۔ کاش آب آب ہوجاتا کہ اس میں اور صورتیں بھی دکھائی دیتیں۔ اور کثرتِ نظارہ سے تنگیٔ چشم اس کی دفع ہوجاتی۔ مصنف اسی مضمون کو باندھنا چاہتے تھے۔ مگر جن الفاظ میں ادا کیا ہے وہ ادائے مطلب سے قاصر ہیں۔ "حسد پیمانہ" کہنے سے یہ مراد ہے کہ مثل پیمانہ کے کم ظرف ہے۔ عالم آب ہوجائے تو وسعت پیدا ہو۔ پھر عالم کی اضافت تماشا کے طرف اس غرض سے ہے کہ وہ عالم آب جو تماشا رکھتا ہو۔ اس طرح معنیٰ نکالنا ایک پہیلی بوجھنا ہے۔ پھر بھی الفاظ جو مصرعہ کے ہیں وہ اب بھی قاصر ہیں۔ نظر ثانی میں مصنف نے مصرعہ بدل دیا ع حسد سے دل۔ . . . الخ۔ عالم آب۔ شراب کو بھی کہتے ہیں اسے پیمانہ کے ساتھ ایہام تناسب ہے۔

کرے کیا سازِ بینش وہ تماشا رنج آگاہی

جسے موئے دماغ بیخودی خواب زلیخا ہو

کرے کیا ساز بینش وہ شہید درد آگاہی

وہ تماشا رنج آگاہی دانش بینش سے کیا تعلق رکھے جس کی بیخودی خواب زلیخا کو موئے دماغ سمجھے جو بیخودی کو راحت اور آگاہی کو رنج جانتا ہو۔ وہ کیوں ساز و سامان بینش کرے۔ تماشا رنج آگاہی وہ شخص جس نے آگاہی کے تماشے سے رنج اٹھایا ہو۔ اس ترکیب میں کنجلک مصنف کو معلوم ہوئی۔ تو شہید درد آگاہی بنا دیا۔

بقدر حسرت دل چاہیئے عیش معاصی بھی

بھروں یک گوشۂ دامن۔ گر آب ہفت دریا ہو

بقدر حسرت دل چاہیئے ذوق معاصی بھی

لذت معاصی کو عیش معاصی کسی نے نہ کہا ہوگا۔ نظر ثانی میں مصنف کو خود شبہ ہوا تو عیش کی جگہ ذوق بنا دیا۔

اگر وہ سرو جاں بخش خرام اہتزاز آوے

کف ہر خاک گلشن شکل قمری نالہ فرسا ہو

اگر وہ سرو قد گرم خرام ناز آجاوے

پہلے مصرعہ میں تین اضافتیں اور ایک کسرۂ توصیفی ناگوار خاطر ہوا مصنف نے اس میں اصلاح کر دی۔ ع اگر وہ سرو قد ..... الخ۔ یعنی وہ سرو جو خرام نشاط میں جان ڈال دیتا ہے۔ اہتزاز سے نشاط مراد ہے۔

صفحہ ۱۵۵

ہندوستان سایۂ گل پائے تخت تھا

جاہ و جلال عہد وصال بتاں نہ پوچھ

سامان بادشاہئ وصل بتاں نہ پوچھ

پایہ تخت کا لفظ محض جاہ و جلال نہیں سامان بادشاہی کو مانگتا تھا۔ مصنف نے مصرعہ اس طرح بنا دیا۔ ع سامان بادشاہی... الخ ہندوستاں میں اضافت بیانیہ ہے۔ سایۂ گل کو سیاہی کی مناسبت سے ہندوستان کہا ہے۔ سایۂ گل کو ہندوستان کہنا شوکت بخاری کا مضمون تھا۔ اس وجہ سے شعر کو کاٹ دیا۔

کہتا تھا کل وہ محرم راز اپنے سے کہ ہاں

درد جدائی اسد اللہ خاں نہ پوچھ

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوز دل

پہلے مصرعہ میں "محرم راز اپنے سے" اور "کہ ہاں" تعقید اور حشو کا عیب رکھتے ہیں۔ یہ دونوں طرح کے عیب اس مصرعہ میں نہیں ہیں۔ ع کہتا تھا کل وہ . . . الخ۔ سوز دل اس میں بھی برائے بیت ہے اور کل کی بھی کیا خصوصیت ہے۔ آج کہتا تو کیا برا تھا۔ غرض کہ بیت انتخاب میں نہ آئی۔

صفحہ ۱۵۹

ہے خط عجز ما و تو اول درس آرزو

کہتے ہیں اہل گفتگو کچھ نہ سمجھ فنا سمجھ

ہے یہ سیاق گفتگو کچھ نہ سمجھ فنا سمجھ

درس آرزو کی پہلی کتاب ما و من کے خط عجز کا سمجھنا ہے۔ یعنے ماسوی اللہ کا خط عجز کیا معنے رکھتا ہے۔ اس کا سمجھنا اول آرزو ہے۔ اہل گفتگو کہتے ہیں خط عجز سے یہ معنے نکلتے ہیں۔ کہ سب ہیچ ہیں۔ مصنف نے دوسرے مصرعہ پر ایسی اصلاح کی کہ شعر ترقی کے درجۂ اعلیٰ پر پہنچ گیا۔ ع ہے یہ سیاق . . . الخ یعنے ما و تو محض سیاق گفتگو و اعتبار محض ہے۔ اصل میں نہ متکلم کے لیے تحقق ہے نہ مخاطب کے لیے۔

صفحہ ۱۶۱

للکد کوب حوادث سے نہ سر بر ہو سکی آخر

میری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

لکد کوب حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی

شاید لفظ سر بر کی صحت میں شبہ گزرا جو اُسے نکال ڈالا۔

صفحہ ۱۶۴

اسد ہے دل میں درد اشتیاق و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوۂ ہجراں

یہاں مصرعہ بدلنے کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن طبیعت شعر میں مراعات کا رکھنا داخل ہے۔ مصنف نے درد اشتیاق کو ترک کر کے شوق وصل بنا دیا۔ اب وصل و ہجر کی مراعات نے شعر کے حسن کو زیادہ کر دیا۔ دوسرے یہ کہ اسد دل میں یہ ہے۔ اس سے یہ فقرہ واضح تر ہے۔ ع مرے دل میں ۔ ۔ ۔ ۔ الخ

صفحہ ۱۶۴

ہے بارے اعتماد وفاداری اس قدر
ہم بھی اسی میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے
غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

مصرعہ ثانی میں کوئی سقم تو نہ تھا مگر مصنف کو منظور ہوا کہ بیت کو مقطع کر دیں۔ اس وجہ سے تصرف کیا۔ ع غالب ہم ۔ ۔ ۔ ۔ الخ

صفحہ ۱۶۶

عالم بساطِ دعوتِ دیوانگی نہیں
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے
وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا

پہلا مصرعہ نہایت مبہم ادائے مطلب میں قاصر ہے۔ مطلب یہ کہ فضائے عالم کی اتنی بساط نہیں کہ دیوانوں کو صحرا نوردی کی دعوت دے سکے۔ اس مصرعے کو بدل کر مصنف نے معانی کو واضح کر دیا۔

ع وحشت پہ میری . . . . الخ۔

پہلو تہی نہ کر غم و اندوہ سے اسد
دل وقفِ درد کر کہ فقیروں کا مال ہے
ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

پہلو تہی . . . الخ۔ پہلے اس غزل کا مقطع یہ تھا لیکن نہ معلوم کیا بات مصنف کو بُری معلوم ہوئی جو کاٹ دیا۔ اس کے سوا کوئی وجہ ذہن میں نہیں آتی کہ فقیروں کا مال احباب کے لیے وقف ہوتا ہے جو خود بھی فقیر ہوتے ہیں۔ درد و اندوہ کو فقرا میں کسی نے شمار نہیں کیا، یہ وجہ سستی کی اس مقطع میں معلوم ہوتی ہے۔ دوسرا مقطع یہ کہا "ہستی کے مت فریب . . . الخ" مضمون کے اعتبار سے بھی یہ مقطع بلند ہے۔

صفحہ ۱۶۷

اسد یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے
دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر

اسد یہ . . . الخ۔ اس مقطع میں مصنف نے تخلص کو کاٹ کر دلا بنا دیا۔ وجہ یہ کہ اس زمین میں دو ہی شعر انتخاب میں آئے تھے۔ جہاں مطلع نکال ڈالا تھا مقطع بھی نکال ڈالا۔ سات شعر کی غزل تھی اس میں

دو رہ گئے۔

صفحہ ۱۷۴

تو وہ بد خو کہ تحیر کو تماشا جانے

دل وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

نظر ثانی میں دل کو افسانہ کہنا نادرست معلوم ہوا۔ ورنہ دل کو افسانہ کہہ سکتے تھے مگر مصرعہ میں گنجائش نہ دیکھی دل دو حرف کا لفظ تھا آسما کی جگہ غم بنا دیا۔

وہ تپ عشق تمنا ہے کہ جوں رشتۂ شمع

شعلہ تا نبض جگر ریشہ دوانی مانگے

وہ تپ عشق تمنا ہے کہ پھر صورت شمع

شاید جوں کا لفظ مصنف کو نکالنا منظور تھا کہ خلاف محاورہ اردو ہے۔ مجھے نہیں یاد پڑتا ہے کہ مصنف نے اپنے کسی مکتوب میں اس لفظ کو استعمال کیا ہو۔ نثر میں جو لفظ ہندی برا معلوم ہوتا ہو وہ شعر میں بھی برا معلوم ہو گا۔ غرض مصرعہ کی اصلاح اس طرح ہوئی۔ ع وہ تپ عشق تمنا ہے کہ پھر صورت شمع۔ یہ اصلاح تو ہوئی مگر اس پر نظر نہ پڑی کہ "تپ عشق تمنا ہے" کہاں کا محاورہ ہے۔ مقصود یہ تھا کہ اس بات کی تمنا ہے کہ تپ عشق پیدا ہو۔ اور معنی یہ ہو گئے کہ تمنا ایسی تپ ہے کہ صورت شمع ...... الخ۔

ے یادِ مژگاں میں بہ نشتر زارِ صحرائے خیال

چاہیئے بہر تپش یکدست صد پہلو مجھے

یاد مژگاں میں بہ نشتر زار سودائے خیال

چاہیے وقتِ تپش یکدست صد پہلو مجھے

صحرائے مژگاں کے نشترزار یعنے خارزار میں تڑپنے کے لیے سَو پہلو مجھے چاہیئے۔ جہاں اتنے نشتر ہوں وہاں دو پہلو کافی نہیں۔ نظرِ ثانی میں نشتر کے خیال سے صحرائے خیال کو سودائے خیال بنا دیا۔ یہی مناسب تھا مگر پھر تپش کو وقتِ تپش بنا دینا کچھ مفید نہ ہوا۔ پھر یکدست کا لفظ محض رعایت ایہام کے لیے تھا۔ وہ اب بھی حشو قبیح کی طرح بُرا معلوم ہو رہا ہے۔ آخر یہ بیت انتخاب سے محروم رہی۔

صفحہ ۱۷۵

کثرتِ جور و ستم سے ہو گیا ہوں بے دماغ

خوبرویاں نے بنایا اس لیے بدخو مجھے

خوبرویوں نے بنایا غالبؔ بدخو مجھے

تعجب ہے کہ دوسرے مصرعہ کو نظرِ ثانی میں اس طرح بدل دیا۔ اگر وزن مانوس کے لحاظ سے (غالب بدخو بکسرۂ توصیفی پڑھے تو نہایت ناگوار معلوم ہوتا ہے) غالب سے یہ امر نہایت بعید معلوم ہوتا ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ اگر واقع میں مصنف نے یہ تصرف کیا ہے تو کسرۂ توصیفی ہرگز نہیں لائے میں بغیر کسرہ اسے پڑھنا چاہیئے۔ اس سبب سے کہ فاعلاتن اند مفتعلن کی فرع مفعولن بھی ہو سکتی ہے۔ گو اُردو میں بُرا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے

ع ناسخ قول ہے بجا حضرت میر درد کا۔

صفحہ ۱۷۶

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا

نہ ہوے گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

دوسرے مصرعہ کو اس طرح بدلنے کے بعد یہ معنی صاف طور سے نکلتے ہیں کہ تم لوگ یہ کہتے ہو کہ میرے اشعار میں معنی نہیں ہیں۔

صفحہ ۱۷۷

سیہ مستی ہے اہل خاک کو ابر بہاری سے

زمیں کیفیت یک جام لبریز سفالی ہے

زمیں جوشِ طرب سے یک جام لبریز سفالی ہے

زمیں کو کیفیت جام کہنا بے لطفی سے خالی نہ تھا۔ مصنف نے یوں اصلاح کی ع زمین جوش . . . . الخ۔ یعنے زمین کا جوش طرب ابر کا اٹھتا ہے۔ جس سے زمین جام لبریز سفالی ہوگئی ہے۔ جس سے اہل زمین سیہ مست ہوگئے ہیں۔

صفحہ ۱۷۹

از بسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے انداز سے

داغوں کا نظر آنا خود چشم نمائی ہے

جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

دوسرے مصرعہ میں خود کا لفظ برائے بیت تھا۔ پھر داغوں کا جمع ہونا بیکار تھا۔ اس مصرعہ کو اس طرح بدل دیا۔ ع جو داغ نظر . . . . الخ۔ اب وہ دونوں سقم نکل گئے۔

صفحہ ۱۸۱

اسد یہ فرط غم نے کی تلف کیفیت شادی

کہ صبح عید مجھ کو بدتر از چاک گریباں ہے

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی

یہ کہنا لفظ اس قدر کے معنی پر شعرا کے استعمال میں بہت ہے۔ مگر سبھی کو برا معلوم ہوتا ہے۔ مصنف نے اس مصرعہ پر یوں اصلاح کی۔

ع ہوئی یہ . . . الخ۔ اس میں بھی وہی یہ موجود ہے۔ اصلاح سے مقصود یہی تھا شاید مقطع کو بیت کر دیں۔ اس زمین میں تین غزلیں کہیں۔ ان میں سے صرف پانچ شعر انتخاب کئے۔ ہر غزل میں مقطع بھی تھا۔ اس مقطع کے سوا کوئی مقطع انتخاب میں نہیں آیا۔

صفحہ ۱۸۴

چشم خوباں مے فروش نشہ زار ناز ہے
سرمہ گویا موجِ دودِ شعلۂ آواز ہے

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

چشم خوباں مے فروش . . . الخ۔ اس مطلع میں نشہ زار غریب لفظ ہے اس کے علاوہ سرمہ کو دودِ شعلہ آواز تو کہا مگر مصرعہ لگانے میں کچھ اس کا لحاظ نہ کیا۔ مے فروش کے لفظ سے صدا کے معنے نکالنا بہت بعید ہے گو کوئی مے فروش صدا بھی لگاتا ہو مگر یہ معنی صاف نہیں نکلتے۔ غرض اصلاح اس طرح ہوئی۔ ع چشم خوباں خامشی . . . الخ
لفظ نوا پرداز سے شعلۂ آواز بلند ہوا۔

صفحہ ۱۸۵

غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
آرزو خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

ایک تو ردیف ہی اُردو میں خلاف محاورہ ہے۔ دوسرے آرزو خانہ کیا چیز مصنف نے ردیف کا تو کچھ خیال ہی نہیں کیا۔ گویا کہ اُردو کوئی زبان ہی نہیں۔ اُس میں محاورہ کی پابندی خصوصاً نظم میں لازمی نہیں۔ آرزو خانہ کا لفظ کھٹکا کہ یہ فارسی میں کہیں آیا ہوگا۔ نہ اردو میں، اصلاح یوں کی۔ کس قدر خانہ آئینہ ہے۔ . . . الخ۔ اب بھی اس شعر کا انتخاب میں آنا تعجب ہے۔

صفحہ ۱۸۶

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں

ورد کی طرح رہا سایہ گریزاں مجھ سے

صورت دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

کاتب نے غلطی سے بجائے دود کے ورد لکھا ہے اصلاح کی جائے دود کی طرح ایک اُردو کا محاورہ لیے ہوے لفظ تھا۔ اسے نظرِ ثانی میں صورتِ دود بنا دیا۔ یہ محض فارسیت کا لحاظ تھا۔ مگر اتنا کہوں گا کہ صورتِ دود فارسی ترکیب تو ہے۔ بلاشک لیکن اس کی نظیر اہلِ زبان کے کلام سے ملنا دشوار ہے۔

اثرِ آبلہ کرتا ہے بیاباں روشن

جادہ جوں رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں

صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

اثرِ آبلہ کرتا ہے . . . الخ۔ نظرِ ثانی میں مصنف نے اس بیت میں دوسری

طرح کی ترتیب دی جو دینا چاہئے تھی۔ صورت رشتہ بھی صورتِ دود کی نظیر ہے۔

بیکسی ہائے شب ہجر کی وحشت مت پوچھ
سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

بیکسی ہائے شب ہجر کی حسرت ہے ہے

یعنے میری بیکسی کو دیکھ کر خود میرے سایہ کو ایسی وحشت ہوئی کہ وہ خورشید قیامت میں جاکر چھپ رہا۔ اصلاح اس پر یوں ہوئی۔
ع بیکسی ہائے شب ہجر کی حسرت . . . . الخ۔ یعنے ہے ہے شب ہجر کی بے کسی خود میرا سایہ مجھ سے ایسا بیزار ہوا کہ خورشید محشر میں جاکر چھپ رہا۔ اب یہ بیت کس قدر ترقی کر گئی ہے دیکھنے کی بات ہے مشہور نسخہ میں حسرت کی جگہ وحشت ہے۔

صفحہ ۱۸۸

عزیزاں گرچہ بہلاتے ہیں ذکرِ وصل سے لیکن
مجھے افسون خواب افسانۂ خواب زلیخا ہے

عزیزو ذکرِ وصلِ غیر سے مجھ کو نہ بہلاؤ
کہ یاں افسون خواب افسانۂ خوابِ زلیخا ہے

عزیزاں گرچہ . . . الخ۔ معانی ظاہر نہیں۔ شاید یہ مقصود ہے کہ میرے سلانے کو ذکرِ وصل کا افسوں چارہ ساز پڑھتے تو ہیں لیکن میرے لیے یہ افسوں افسانۂ خواب زلیخا کا حکم رکھتا ہے اور نیند اڑی جاتی ہے۔ یعنے زلیخا خواب میں عاشق ہوئی تو عشاق کی طرح خور و خواب سے محروم ہو گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ مرزا صاحب زلیخا کی رعایت سے عزیزاں

لائے اور کس تکلف سے لائے کہ مدراس کی اُردو معلوم ہوتی ہے۔
آخر میں شعر کو اس طرح بدل دیا۔ عزیز و ذکر . . . الخ۔ یعنے وصل غیر
کے ذکر پر تو اور آئی ہوئی نیند اُڑ جائے گی۔

صفحہ ۱۸۹

نہ لائے شوخیٔ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس سودن عہدِ تجدیدِ تمنا ہے
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

ایک زمانہ وہ تھا کہ اردو میں فارسی کے مصادر کا بے تکلف صرف
کرنا مصنف کو تازگیٔ لفظ کا لطف دیتا تھا۔ آخر رائے بدل گئی

سودن کی جگہ ملنا بنا دیا۔

عیادت بسکہ تجھ سے گرمیٔ بازارِ بستر ہے
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے
خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو

عیادت بسکہ . . . الخ۔ یعنے تیرا عیادت کو آنا بستر بیمار کے لیے
رونق کا باعث ہے۔ لیکن بستر کی گرمیٔ بازار عجب شوخیٔ تحریر ہے۔ پھر
عیادت تجھ سے دیکھیے کیسی ناگوار تعقید رکھتا ہے۔ اس کے بعد اصلاح
خوب کی۔ ع خوشا اقبال . . . . الخ

صفحہ ۱۹۰

سرشک سر بصحرا دادہ نور العین داماں ہا
دل بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے
سرشک سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے

مصرعہ اولیٰ میں داماں ہا کس قدر نامناسب لفظ تھا۔ یہاں جمع کا کیا کام تھا لیکن ابتدائے مشق۔ آخر نور العین داماں ہا کو نور العین داماں ہے بنا دیا۔

بہ طوفاں گاہ جوشِ اضطرابِ وحشتِ شبہا
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

یہ طوفاں گاہ جوشِ اضطرابِ وشامِ تنہائی

نظرِ ثانی لفظ شبہا پر پڑی۔ مصرعہ کو اس طرح بدل دیا۔ بطوفاں گاہ... الخ مگر یہ چار چار اضافتیں بھی بری معلوم ہوتی ہیں۔ کچھ فارسی کے لیے خصوصیت نہیں ہے۔ اس کا ترجمہ اردو میں کر کے دیکھئے۔ تنہائی کی شام کے اضطراب کے جوش کے طوفان گاہ میں۔

اسد جوشِ بہارِ دیدۂ بیدار کے صدقے
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

کبھی آتی ہے بُو باش سے اس کی زلفِ مشکیں کی

دیدۂ بیدار سے جوشِ بہار ہونا کیا معنی ایک عجیب بات ہے۔ مصرعہ اس طرح بدلا۔ ع کبھی آتی ہے...... الخ۔ لیکن یہ مصرعہ اس قدر عاشقانہ ہے کہ اس زمانے کے سخن سنج جن میں تعلیم انگلش کی بدولت رہبانیت کا رنگ بھی آ گیا ہے۔ یہی کہیں گے کہ اس مصرعہ سے جوشِ بہارِ دیدہ والا مصرعہ بہتر ہے۔ شاید طبع دیوان کے وقت پھر اس شعر پر یہ اصلاح ہوئی کہ کبھی کی جگہ ابھی بنا دیا۔ مطبوعہ دیوانوں میں یہی نسخہ ہے۔

صفحہ ۱۹۱

جلوۂ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے
عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد

لفظ جلوہ پر مصنف کی نظر پڑی یعنے جلوۂ گل دیکھ کر یار یاد آیا کہنا چاہیئے تھا۔ جلوہ کی جگہ عارض بنا دیا اب کلام میں ربط پیدا ہو گیا۔ اس لیے کہ عارضِ گل کو روئے یار کہنا زیادہ تر مناسب ہے۔

صفحہ ۱۹۴

یاد ہے شادی میں عقدِ نالۂ یارب مجھے
سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے
یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے

عقد یارب کوئی اصطلاح اہل ذکر کی نہیں ہے خدا جانے پہلے کیا سمجھ کر عقد نالۂ یارب کہہ گئے تھے پھر اس طرح مصرعہ کی اصلاح کی۔
ع یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے۔

صفحہ ۱۹۵

بہ پیچ و تاب ہوس سلکِ عافیت مت توڑ
نگاہ خفتہ سر رشتۂ سلامت ہے
نگاہِ عجز سر رشتۂ سلامت ہے

نگاہ خفتہ سے وہ نگاہ مراد ہو سکتی ہے جس سے دل میں ہوس نہ پیدا ہو۔ جو نگاہ خفتہ ہو گی وہ کچھ دیکھ ہی نہ سکے گی۔ ہوس سے بچی رہے گی۔ اس میں کچھ قباحت نہ تھی مگر مصنف نے نظرِ ثانی میں نگاہ عجز بنا دیا۔ شاید نگاہ کے خفتہ کہنے کے لیے سند کی ضرورت سمجھے۔

شوخیٔ اظہار دندانہا برائے خندہ ہے
دعوے جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں برائے خندہ ہے

جہاں دنداں کہنا کافی ہو وہاں دندانہا برائے بیت معلوم ہوتا ہے۔ مصرعہ کو اس طرح بدل دیا۔ ع عرضِ ناز۔ . . . الخ۔ اب بھی یہ مطلع انتخاب میں آنے کے قابل نہ تھا۔ ہنسنے ہی میں سلک دنداں دکھائی دیتی ہے اور جمعیتِ احباب کی صورت نظر آجاتی ہے۔

ہیں عدم میں غنچہ ہا عبرت کشِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل

اس بیت میں بھی غنچہ کی جگہ غنچہا محض برائے بیت تھا۔ اصلاح اس طرح ہوئی۔ ع ہے عدم میں غنچہ محو عبرت۔ . . . الخ۔ غنچہ خنداں ہونے کے بعد خود فنا ہوجاتا ہے اور گل پردۂ نیستی سے نکل کر عبرت آبادِ ہستی میں آجاتا ہے۔ اب غنچہ عدم میں بصد زانوئے فکر یہ سوچ رہا ہے کہ دیکھئے گل کا کیا انجام ہوتا ہے۔

عیش بے تابی حرام کلفت افسردگی
عرضِ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام
ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

پہلے فکر میں دونوں مصرعوں کی بندش تکلف و تصنع میں الجھی ہوئی

تھی۔ اصلاح یہ ہے۔ کلفت افسردگی۔ ۔ ۔ الخ۔ عشاق افسردگی کو رنج اور بے تابی کو عیش تصور کرتے ہیں۔ دنداں در دل افشردن ایک بے تابانہ حرکت ہے۔ جس سے غنچۂ دل خنداں ہو جاتا ہے۔ عرض کے معنی دکھانے کے اور نمائش کے ہیں۔ درینہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر افسردہ دلوں کو عیش حرام نہ ہوتا تو حرکت بے تابانہ کا لطف اُٹھاتے۔

صفحہ ۱۹۹

ہے لخت دل سے جوں مژہ ہر خار شاخ گل
تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی

لخت جگر سے ہے رگ ہر خار شاخ گل

ہے لخت دل۔ ۔ ۔ الخ۔ پہلی فکر ہے۔ نظر ثانی میں دجوں مژہ) کال ڈالا خار صحرا کو لخت جگر سے شاخ گل بنا دینا باغبان صحرا کے مثل ہے۔

ہے وحشت طبیعت ایجاد نالہ خیز
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

ہے وحشت طبیعت ایجاد یاس خیز

نظر ثانی میں نالہ کی جگہ یاس بنا دیا ہے اس لیے کہ نالہ خیز و فغاں خیز و فریاد خیز محاورہ کے الفاظ نہیں ہیں گو ترکیب درست ہے۔ اسی طرح یاس خیز و درد خیز میں بھی کوئی قباحت نہیں۔

صفحہ ۲۰۲

پا تراب سیل طوفان صدائے آب ہے
نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

آمدِ سیلاب طوفانِ صدائے آب ہے

شاید ایک تو یہ شک کہ پاتراب زبان فارسی کا محاورہ ہے یا ہندیوں کا
تراشا ہوا لفظ۔ پاتراب کی اضافت صحیح ہے یا غلط۔ دوسرے یہ کہ
پاتراب تو کہیں جانے کے لیے ہوتا ہے اور یہاں سیل کا آنا مقصود
ہے نہ کہ جانا لفظ کو بدل دیا اور پاتراب کی جگہ "آمد" بنا دیا۔

صفحہ ۲۰۴

غفلت کفیل عمر و اسد ضامن وفا
اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے
غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط

غفلت اس امر کی کفیل ہے کہ عمر کے فانی ہونے کا خیال بھی نہ کرو
اور میں خود اس بات کا ضامن ہوں کہ عمر بے وفائی نہ کرے گی جو ایسا
غافل ہو اس کی موت ناگہانی نہ ہو گی تو کیا ہو گی۔ نظر ثانی میں یہ ترقی
کی کہ وفا کی جگہ نشاط بنا دیا۔ یعنے یونہی نشاط میں بسر ہوا کرے گی۔

فشار تنگیٔ صحبت سے آتی ہے شبنم
صبا جو غنچہ کی خلوت میں جا نکلتی ہے
فشار تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچہ کے پردہ میں جا نکلتی ہے

یعنے صبا شبنم ہو کر آتی ہے۔ یہ عجیب طرح کا تصرف زبان میں ہے لیکن
نظر ثانی میں بدلنا پڑا۔ فشار تنگیٔ خلوت . . . الخ

صفحہ ۲۰۵

ہے تار و پود فرش تبسم بہ بزم عیش
صبح بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

در کار ہے شگفتن گلہائے عیش کو

یعنے وہ پنبۂ مینا جسے صبح بہار کہنا چاہیئے۔ فرش تبسم کا تار و پود
دتانا بانا) بن گئی ہے۔ تانا بانا کسی کپڑے میں ہوتا ہے۔ اس خیال نے
تبسم کو فرش سے استعارہ کیا۔ اس میں نہایت تصنع و تکلف جسے بنوٹ
کہتے ہیں پیدا ہوگیا ہے۔ مصنف کی نظر اصلاح اس ستم پر پڑی۔ مصرع
کو اس طرح بدل دیا۔ در کار ہے۔ . . . الخ۔ پنبہ سے تار و پود بھی بنتا
ہے اور پنبہ مینا سے صبح بہار کی طرح گلہائے عیش بھی شگفتہ ہوتے ہیں
پہلی نظر فقط لفظِ پنبہ پر تھی۔ اب دوسری نظر میں پنبۂ مینا کے تمام مناسبات
جمع کر دیئے۔

صفحہ ۲۰۶

دل خوں شدۂ کشمکش کثرتِ اظہار

آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار

مصرعہ اولیٰ میں کثرت اظہار کی کشمکش سے بھی دل پس کر خون ہو سکتا
ہے۔ اور حسرتِ دیدار کی کشمکش بھی دل کو خون کر سکتی ہے لیکن حسرتِ
دیدار زیادہ تر آئینہ کے مناسب ہے۔ اسی وجہ سے نظر ثانی میں کثرتِ
اظہار کو حسرتِ دیدار بنا دیا۔

مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ الفت

دامن تہ سنگ آمدہ احرامِ وفا ہے

دست تہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

محض احرام کے بدلے جامۂ احرام آسکتا تو یہ مصرعہ بھی بہت اچھا تھا۔

اس لفظ کی کمی مصنف کو نظرِ ثانی میں بہت بُری معلوم ہوئی۔ مصرعہ کو کس خوبی سے بدل دیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ دست تہ۔۔۔ الخ۔

صفحہ ۲۱۱

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے مجبور ہے
ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

مطبوعہ دیوان میں اس شعر کا قافیہ مجبور کی بجائے ناچار ہے۔ یہ شعر اصل میں اُس زمین کا تھا جس کا قافیہ رنجور و مجبور تھا وہ ساری غزل انتخاب میں نہ آئی بس یہی ایک شعر تھا جس کے کاٹتے پر اُستاد کا قلم نہ اُٹھا۔ دوسری زمین میں سرشار ہے اور ناچار ہے۔ ردیف و قافیہ تھا اُس میں اس شعر کا قافیہ بدل کر داخل کر دیا۔ مجبور کی جگہ ناچار بنا دیا۔

صفحہ ۲۹۳

سبز جوں جام زمرد نہو گر داغ پلنگ
نشۂ نشو و نما کو سمجھ افسونِ بہار
سبز ہے جام زمرد کی طرح داغ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

سبز جوں۔۔۔ الخ۔ یعنے اگر داغ پلنگ کو جام زمرد نہ بنا دے تو وہ بہار کیا۔ یہاں داغ پلنگ کی کوئی خصوصیت بیان نہیں کی تھی۔ پھر اس بیت کی اصلاح کیا خوب کی۔ سبز ہے۔۔۔ الخ۔ اب داغ پلنگ اور دانۂ شرار کے ذکر سے نشو و نما کی تعمیم ظاہر ہو گئی کہ گل بوٹوں ہی کے ساتھ اُسے تخصیص نہیں ہے۔ حیوانات وغیرہ میں بھی پائی جاتی ہے۔

صفحہ ۲۹۴

کف ہر خاک چمن آئینہ قمری صیقل
دام ہر کاغذ آتش زدہ طاؤس شکار

کف ہر خاک بگردوں شدہ قمری پرواز

قمری خاکستری رنگ کی ہوتی ہے۔ اُسے کف خاکستر شعرا باندھتے ہیں اور خاک سے آئینہ پر صیقل بھی ہوتی ہے۔ بہار کی تشبیب میں کہتے ہیں کہ چمن کی ہر کف خاک قمری کے آئینہ پر صیقل کرتی ہے۔ اس میں آئینہ قمری صیقل کی ترکیب بہت نامانوس و ناگوار ہے۔ اصلاح یہ ہوئی۔ "کف ہر خاک بگردوں۔ ۔ ۔ ۔ الخ۔ یعنے فصل ایسی جانفزا ہے کہ ہر کف خاک قمری بن کر اڑ گئی۔

جوہر ناخنِ بُریدہ بہ انداز ہلال
ریشۂ عجز کو کرتا ہے نمو سے سرشار

کاٹ کر پھینکئے ناخن تو بہ انداز ہلال
قوت نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

پہلے مصرع میں جوہر کا لفظ بے محل بُریدہ کی تشدید ثقیل۔ دوسرے مصرع میں ریشۂ عجز میں تصنع۔ نمو سے بالیدہ ہونا چاہیے تھا نہ کہ سرشار سارا بیت کاٹ دینے کے قابل تھی۔ اصلاح میں اس مضمون کو دوسری طرح کہہ کر دکھا دیا۔ "کاٹ کر پھینکئے"۔ ۔ ۔ ۔ الخ۔ یعنے قراضۂ ناخن کو ہلال کی طرح قوت نامیہ بدر بنا دے گی۔

صفحہ ۲۹۵

بے دماغی تپش سے ہوئی عریاں آخر

شاخِ گلبن پہ صبا چھوڑ کے پیراہنِ خار

جوشِ بیدادِ تپش سے ہوئی عریاں آخر

تخئیل یہ کی ہے کہ گلاب کی ٹہنی میں جو کانٹے ہیں۔ صبا اس پیراہنِ خار کو گویا پہنے ہوے تھی۔ کانٹے جو چبھے تو شاخِ گل پر اس پیراہن کو چھوڑ کر ننگی ہو گئی ہے۔ نظرِ ثانی میں "بے دماغی" کا لفظ نکال کر "جوشِ بیداد" بنا دیا ہے۔ لیکن کانٹے چبھنے کو خلش کہنا چاہئے تھا نہ کہ تپش شاید کاتب کی غلطی ہو۔ بہرحال یہ شعر انتخاب میں نہ آیا۔

موجِ گل ڈھونڈھ بہ طوفاں کدۂ غنچۂ باغ

گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

موجِ گل ڈھونڈھ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ

فیض نامیہ سے گوشۂ میخانہ غنچہ اور دستار موجِ گل بن جائے گی۔ اس بیت کی اصلاح میں مصنف نے غنچہ کے لیے خلوت کدہ کا لفظ تجویز کیا اور بے شک طوفان کدہ سے زیادہ تر مناسب ہے۔

صفحہ ۲۹۶

لعل سے کی ہے بمدح چمن آرائے بہار

طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ

بہار کی تشبیب میں ایک مطلع تو ہو چکا تھا اب دوسرے مطلع کی ضرورت ہی نہ تھی۔ بمدح کی ب اردو کے محاورہ میں بری معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ چمن آرائے بہار سے شبہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کو مراد لیا ہے اور

مقصود امیر المومنین ہیں۔ بہرحال مصرعہ یوں بدل دیا۔ "لعل سے کی ہے پئے زمزمہ"۔۔۔ الخ۔

صفحہ ۳۰۰

جوہر دست دعا آئینہ یعنے تاثیر
یک طرف نازش خرگاں یہ دگر سو غم خار
یک طرف نازش مژگاں و دگر سو غم خار

"جوہر دست دعا آئینہ" یعنے آئینہ دست دعا کا جوہر تاثیر ہے یعنے ممدوح کی دعا جوہر تاثیر رکھتی ہے۔ اس آئینہ کا جوہر غیرت خرگان خوباں و رشک خار مغیلاں ہے۔ تعجب ہے کہ یہ شعر قصیدہ کے منتخب اشعار میں ہے۔ یعنے قصیدہ ایک سو دس شعر کا تھا۔ مصنف کا یہ مصرعہ شاہد ہے۔

ع "ہوں بقدر عدد حرف علی سبحہ شمار" ایک سو دس میں سے اٹھائیس انتخاب ہوئے تھے۔ ان میں بھی اکثر اُلجھے ہوئے ہیں۔ اُن میں سے یہ دست دعا آئینہ والا شعر ہے۔ بہ دگر سو کے لفظ میں ب کس قدر محاورہ اُردو کے خلاف ہوتی ہے۔ مگر ابتدا میں مصنف کو نہ معلوم ہوئی۔ انتخاب کے وقت ب کو کاٹ کر واو عطف بنایا۔

صفحہ ۳۰۱

مردمک سے ہو عزا خانۂ یک شہر نگاہ
خاک در کی تری جو چشم نہ ہو آئینہ دار
مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ

جو آنکھ تیری خاک در کی آئینہ دار نہ ہو اس کی مردمک عزا خانۂ نگاہ بن جائے یعنے وہ آنکھ اندھی ہو جائے یک شہر۔ کہنے سے سُننے میں مبالغہ مقصود ہے۔

انتخاب کرتے وقت یک شہر کو کاٹ کر اقبال بنا دیا یعنے جو چشم آئینہ دار نہ ہو
اس کی نگاہ عزا خانۂ اقبال بن جائے۔ اقبال کو رو بیٹھے اب زیادہ تصنع پیدا ہو گیا۔
مجھے تو اقبال کے رونے سے آنکھ کا اندھا ہو جانا زبان و محاورہ سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔

دیدہ تا دل اسد آئینۂ یک سجدۂ شوق
فیض الفت سے رقم تا دلِ معنے سرشار
دیدہ تا دل اسد آئینۂ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

دیدہ و دل آئینہ ہو سکتا ہے لیکن سجدۂ شوق کا آئینہ کیا معنے۔ مطلب
یہ ہے کہ سجدۂ شوق کی آرزو کا پرتو اس آئینہ میں دکھائی دیتا ہے۔ مگر
الفاظ قاصر ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں بھی "رقم تا دل معنے سرشار" ہونا
محل نظر ہے۔ اگر "لفظ تا دل معنے سرشار" ہوتا تو کچھ بہتر تھا لیکن رقم
کی جگہ لفظ پڑھیں تو مصرعہ موزوں نہیں رہتا۔ غرض اس طرح بدل دیا۔
ع دیدہ تا دل اسد آئینۂ یک پرتو شوق۔ الخ۔ ساغر سرشار ہو تو باندھتے
ہیں لیکن خط ساغر کا سرشار ہونا ایک نئی بات ہے۔

صفحہ ۳۰۲

عشق بے ربطیٔ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل افسانۂ اطفال پریشاں بالیں
وصل زنگار رخ آئینۂ حسن یقیں

یعنے عشق بدحواسی کا نام ہے۔ وصل بچوں کی کہانی ہے۔ مگر طفل کی
صفت پریشاں بالیں کہاں سے تراشی آخر اس کے لیے سند کی ضرورت
ہے۔ کسی اہلِ زبان نے بھی اس طرح نظم کیا ہے اور پریشاں بالیں ہونے

سے کیا مراد ہے اُسے کوئی کیونکر سمجھے۔ غرض انتخاب میں اس مصرع کو بدل کر اس شعر کو داخل کیا۔ "وصال زنگار"۔۔۔۔ الخ۔

کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب
بے ستوں ساز گرانباری خواب شیریں
بے ستوں آئینۂ خواب گران شیریں

یعنے کوہ بے ستون وہ باجہ ہے جس سے گران خوابی شیریں کی آواز آرہی ہے۔ مصرع میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس سے آواز کے معنے نکلیں اور بے اس کے شعر بے معنی تھا۔ انتخاب میں دوسرے مصرعہ کو اس طرح بدل دیا۔ "بے ستوں آئینہ"۔۔۔ الخ۔ یعنے بے ستون شیریں کی غفلت کی نیند کا آئینہ ہے۔

صفحہ ۳۰۳

کس نے دیکھا جگر اہل جنوں نالہ فروش
کس نے پایا اثر نالۂ دلہائے حزیں
کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتش خیز

یہاں نالہ فروش کہنے کی کوئی معقول وجہ مصرع پورا کرنے کے سوا نہ تھی۔ نالہ کش کہنے میں مصرع مجہول کہا جاتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے نظر انتخاب کے وقت مصرع کو اس طرح بدل دیا۔ ع کس نے دیکھا نفس۔۔۔ الخ

صفحہ ۳۰۴

کس قدر نالہ پریشاں ہے عیاذاً باللہ
یک قلم خارج آداب وجنون و تمکین
کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ

یک قلم خارج آداب وقار و تمکیں

آداب وجنوں کاتب کی غلطی ہے۔ عطف نہیں ہے اضافت چاہیئے۔ یعنے آداب جنوں سے بھی خارج ہے اور آداب تمکیں سے بھی۔ نالہ کی وجہ پریشانی بھی ہے۔ مگر جنوں کے لیے آداب کیسے۔ یہ محض ایک تھا بیت کو اس طرح بدل دیا۔ ؎ کس قدر ہرزہ سرا۔ . . . الخ۔

کس سے ہو سکتی ہے مدح اس کی بغیر از ہمہ او
شعلہ شمع مگر شمع پہ باندھے آئین

کس سے ممکن ہے تیری مدح بغیر از واجب

ہمہ او اس طرح سے آج تک کسی نے نہ کہا ہوگا گویا ہمہ او اسمائے الہٰی میں ہے۔ وقت انتخاب ہمہ او کاٹ کر واجب بنا دیا۔ گو واجب بھی اسمائے الہٰی میں نہیں ہے مگر ہمہ او کہنے میں جو خامی تھی اب وہ نہ رہی۔

ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں ناز خرام
ہر کف خاک ہے واں گردہ تصویر زمیں
ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرم خرام

ناز خرام کی ترکیب ایسی غریب نہیں ہے جیسے آرزو خرام و وحشت خرام کی۔ لیکن امیر المومنین کی طرف خرام ناز کی نسبت اکثر طبائع کو نامناسب معلوم ہوگی اور اس لیے خود مصنف نے لفظ ناز خرام کو گرم خرام باضافت بنا دیا۔

صفحہ ۳۰۵

جلوۂ تحریر ہو نقش قدم اس کا جس جا
وہ کفِ خاک ہے ناموس دو عالم کی امین
جلوہ پرداز ہو نقش قدم اس کا جس جا

اس بیت میں اتنی ہی اصلاح ہوئی ہے کہ جلوۂ تحریر کو کاٹ کر جلوہ پرداز بنا دیا۔ ان دونوں لفظوں کا فرق سمجھ لینا لطف سے خالی نہیں۔ جلوہ تحریر وہ موصوف ہے جس کی تحریر سراپا جلوہ ہو۔ جیسے آئینہ رخسار وہ شخص جس کا رخسار آئینہ ہو۔ اس طرح دو اسم جمع کر کے اس سے صفت بنا لینا نحو فارسی کا قاعدہ ہے۔ اس قاعدہ کو عربی کے دو اسموں میں جاری کرنے سے احتراز کرنا چاہئے۔ اور اہل قلم اس سے احتیاط کرتے ہیں۔ جلوہ پرداز بہت صحیح ترکیب ہے اور زر بے غش ہے۔

کفر سوز اس کا یہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونق بتخانۂ چین
کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے

اس بیت میں بس اتنی ہی اصلاح کی ہے کہ "یہ" کاٹ کر "وہ" بنا دیا ہے۔ یہ اس قدر کے معنی پر ہے اور وہ ایسا کے معنی پر ہے۔ یہ کی "ی" کا گرنا برا معلوم ہوا لیکن وہ کی "ہ" کا گرنا زیادہ ستم نہیں رکھتا۔

جاں پناہا دل و جاں فیض رساں بادشہا
اے کہ تجھ سے ہے بہار چمنستانِ یقیں
تجھ میں اور غیر میں نسبت ہے ولیکن بہ تضاد
وصی ختم رسل تو ہے بہ فتوائے یقیں

قرینہ سے معلوم ہوا کہ یہ مصرع جس میں تضاد کا ذکر ہے نکال ڈالنا مقصود

تھا۔ پہلی بیت کا مصرع اولیٰ میں ذرا سا تغیر کر کے اور دوسری بیت کا دوسرا مصرع لے کر ایک بیت انتخاب میں رکھی۔

؎ جاں پناہا دل و جاں فیض رسانا شاہا
وصی ختم رسل تو ہے بفتوائے یقیں

ان دونوں بیتوں کے درمیان ایک بیت اور بھی تھی جس کا قافیہ تھا خاک نشیں اسے بھی نکال ڈالا۔

صفحہ ۳۰۶

یا علی جنس معاصی اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
جنس بازار معاصی اسد اللہ اسد

اصلاح کی وجہ ظاہر ہے جنس معاصی سے جنس بازار معاصی بہتر ہے۔

صفحہ ۳۳۷

رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک چشم چشم نم تھا
ہر قطرۂ اشک دیدۂ پرنم تھا

چشم تر صحیح ہے۔ چشم نم غلط ہے اس سبب سے اصلاح میں دیدۂ پرنم بنایا ہے۔

صفحہ ۳۳۸

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لیے
وحشت کدہ تلاش لڑنے کے لیے

مغرور وفا نہ ہو کہ جوں کاغذ باد
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

یعنی ہر بار صورت کاغذ باد

جوں کا لفظ قدما کی زبان پر تھا۔ میر انیس کے قدیم مرثیوں میں بھی موجود ہے۔ مگر ان کے آخر زمانے میں متروک ہو چلا تھا۔ اور یہ وہی زمانہ ہے غالباً جب مرزا غالب کا دیوان مطبوع ہوا ہے اور انھوں نے اپنے کلام پر نظر ثانی کرنے میں نکال ڈالا۔ جوں کاغذ باد کو صورت کاغذ باد بنا دیا۔

تمت بالخیر